تلوک چند محروم

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

شعلۂ نوا

غزلیات کا مجموعہ

تلوک چند محروم

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

ملنے کے پتے

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، نئی دہلی

شاخ دہلی

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ

اُردو بازار دہلی ۶

شاخ بمبئی

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ

پرنسیس بلڈنگ جے جے ہسپتال بمبئی ۳

طبع اوّل سنہ ۱۹۶۰ء

طبع دوم سنہ ۱۹۶۵ء

قیمت چھ روپے پچاس پیسے

کوہِ نور پرنٹنگ پریس لال کنواں دہلی

اِنتساب

رئیس المتغزّلین حضرت جگر مُرادآبادی مرحوم

کے نام

طبع دوم

یہ والدِ محترم کا پانچواں مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے قبل اُن کے جو مجموعے شائع ہو چکے ہیں اُن کی ترتیب وار فہرست یہ ہے۔

گنجِ معانی، رُباعیاتِ محرُوم، کاروانِ وطن اور نیرنگِ معانی

زیرِ نظر مجموعۂ کلام "شعلۂ نوا" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ اِس کی اشاعتِ اوّل کے بعد اُن کے دو اور مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ ایک "بہارِ طفلی" اور دوسرا "بچّوں کی دنیا"۔ یہ دونوں مجموعے ان نظموں پر مشتمل ہیں جو اسکولوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ "بہارِ طفلی" ۱۹۶۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اور "بچّوں کی دُنیا" گزشتہ برس یعنی ۱۹۶۷ء میں۔

اِن سات مجموعوں کے علاوہ والد کی تین اور کتابیں اِس وقت زیرِ ترتیب ہیں۔ ایک میں طبع زاد نظمیں ہیں۔ دوسری کتاب منظوم ترجموں کا مجموعہ ہے۔ یہ منظوم ترجمے انگریزی، فارسی، اور سنسکرت کی نظموں کے ہیں، اور تیسری کتاب اُن کے فارسی کلام پر مشتمل ہے۔ انشاء اللہ یہ تینوں مجموعے بہت جلد قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

نئی دہلی
یکم جنوری ۱۹۶۵ء

جگن ناتھ آزاد

فہرستِ مضامین

شمار		صفحہ

دورِ دوم ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک

شمار		صفحہ
۶۷	نہ وہ محفل، نہ وہ ساقی، نہ وہ جام و سبو باقی	۱۲۴
۶۸	سرورِ عاشقی بعد فنا بھی مونسِ جاں ہے	۱۲۵
۶۹	مجھ سے ہے گرد داستانِ رنج و غم ہے زندگی	۱۲۶
۷۰	ہم جو آہ و فغاں نہیں کرتے	۱۲۷
۷۱	دل ہو تو دل میں تیری تمنا کرے کوئی	۱۲۸
۷۲	مستی انگیز ہے ازبسکہ ہوا ساون کی	۱۲۹
۷۳	جنھیں حسنِ تدبیر کا آسرا ہے • رکے گا نہ کام اُن کا کوئی رکا ہے	۱۳۰
۷۴	نظر آتا ہے اے مجبوریِ ضبطِ فغاں مجھ کو	۱۳۲
۷۵	پہلو میں دل کے موت کا دھڑکا لگا دیا	۱۳۴
۷۶	نہ فضائے باغ ہے دیدنی، نہ گلِ بہار ہے چیدنی	۱۳۶
۷۷	جو سوادِ شامِ فنا میں تو بہ خیالِ صبحِ بقا رہے	۱۳۷
۷۸	اوجِ مقامِ دوست پہ اپنا گزر کہاں	۱۳۸
۷۹	تزئینِ زلف و تابشِ رخ پر نظر کہاں	۱۳۹
۸۰	غلط کہ ہجر میں حاصل مجھے قرار نہیں	۱۴۰
۸۱	اگرچہ فردِ عمل ہم سیاہ رکھتے ہیں	۱۴۱
۸۲	کس ستارے میں تجلیِ سرِ طور نہیں	۱۴۲
۸۳	کیا ہے ہوس بغیر جہانِ خراب میں	۱۴۴
۸۴	کون ہے ضیا افگنِ چاند میں ستارے میں	۱۴۶
۸۵	آہ کو شعلہ بار کیوں نہ کریں	۱۴۷

دیباچہ

(ڈاکٹر اعجاز حسین ایم۔اے۔ ڈی لٹ)

اگر کوئی صنفِ شاعری بیک وقت آسان بھی ہے اور مشکل بھی، تنگ داماں بھی ہے اور بے پایاں و وسیع بھی، تو وہ صنفِ غزل ہے۔ کچھ بندھے ٹکے اصول ہیں، اور بظاہر چند وہ مخصوص و محدود موضوعات جن کو ہر وہ شخص بھی قلمبند کر سکتا ہے جس کو عرفِ عام میں تک بند کہا جاتا ہے، لیکن فن کاری اور شاعرانہ عظمت کے ساتھ انھیں مخصوص و محدود مضامین پر طبع آزمائی کرنا اور جدت و تازگی سے غزل کو حسین و دلکش بنانا اتنا ہی دشوار مرحلہ ہے جتنا روایات کا سہارا لے کر ایک غزل کہہ دینا۔ غزل کی تنگ دامانی کا گلہ اپنی تنگ نظری کا پرتو ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں زیادہ تر حسن و عشق کی باتیں ملتی ہیں، مگر اس واقعہ سے بھی انکار نا ممکن ہے کہ دین و دنیا کی کوئی معقول بات ایسی نہیں جو غزل کے خزانے میں نہ ہو۔ سیاست، مذہب، فلسفہ، اخلاق، تمدن غرضکہ زندگی کے متعلق جتنے اہم پہلو ہیں سب اس کی وسیع دنیا میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ سوال صرف اندازِ بیان کا ہوتا ہے کہ جو بات کہی گئی ہے وہ کتنی دلکش ہے۔ غزل اُس کو اپنے دائرے میں لینا قبول بھی کرتی ہے یا نہیں۔

غزل کا خود ایک مزاج ہے، اختصار، نرمی، اشارہ، کنایہ، معنویت اس کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اگر غزل گو اس راز سے واقف نہیں تو چاہے کتنے دقیق مسائل، کتنے ہی کارآمد نظریات وہ کیوں نہ قلمبند کرے دُنیائے غزل سے "دُور باش" کی صدا آتی رہے گی۔ ظاہری خدوخال، عروض و ہیئت کے خیال سے ہم اس کے کلام کو غزل کے خانے میں رکھ لیں گے لیکن کوئی مخصوص جگہ نہ دی جا سکے گی۔ اس "فنِ شریف" کو نباہنے کے لئے صاحبِ دل، صاحبِ زبان اور اہلِ ہمّت کی ضرورت ہے ہمّت کا مطالبہ اس لئے ضروری ہے کہ اسے مسجد و مندر سے خانقاہی رشتہ توڑنا ہوگا۔ شیخ و برہمن تسبیح و زنّار سے رسمی لگاؤ ترک کر کے دوسروں کی نظر سے نہیں دنیا کو اپنی آنکھ اور اپنے تجربات سے دیکھنا اور سننا پڑے گا، اور دل پر جو بے ساختہ گزرتی ہو اُسے بغیر مذہب و ملت، رسوم و بہر اس کے بے تکلف زبان سے ادا کرنا ہوگا۔ غزل گو کو اپنی دنیا آباد کرنا ہے، اپنے جذبات و خیالات سے دلکش و ہمہ گیر بنانا ہے۔ یہ بیان میرا مفروضہ نہیں، غزل کی دنیا اِس نظریئے سے معمور ہے، اور غزل گوئی ابتدائے آفرینش سے اس پرکاربند ہے، جو غزل گو اس اصول کو جتنی انفرادیت عطا کر سکا اتنا ہی وہ کامیاب و قابلِ احترام سمجھا گیا۔ یہ اور اس قسم کی دوسری خصوصیات جو جانِ غزل اور ایمانِ غزل ہیں اُن کو مدِّ نظر رکھ کر جب ہم تلوک چند محرومؔ کی غزلوں کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا کلام مجموعی حیثیت سے قابلِ قدر ہی نہیں قابلِ احترام بھی ہے۔ اُن کی بیباکی چاہے کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو مگر حُسنِ بیان سے ہر جگہ قابلِ قبول ہو گئی ہے۔ جا بجا اشارے کنائے کی آمیزش لذّت و شعریت سے ہمکنار ہو کر دیر تک لطف لینے کا سامان مہیا کر دیتی ہے۔

محروم صاحب کی غزلوں کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ غزل گو کے لحاظ سے وہ دورِ جدید و دورِ حاضر کے سنگم پر کھڑے ہیں۔ کبھی وہ حالی، اکبر، صفی، سائل اور چکبست کی صف میں نظر آتے ہیں اور کبھی جوش، اقبال، فراق، جگر کے قریب دکھائی دیتے ہیں۔ کلام میں فارسی کی دلآویز ترکیبیں، پختگی کلام کے ساتھ ہی ساتھ پند و اخلاق کی باتیں بھی ہیں۔ سادگی و رنگینی کا حسین امتزاج بھی ہے۔ سہلِ ممتنع کی مثالیں بھی موجود ہیں اور آج کے خیالات و نظریات، تفکر و آزادیٔ خیال، نئے رجحانات کے نمونے بھی کہیں کہیں مل جاتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ منتخب مذاق اور کارآمد خیالات کا مطالعہ نہایت غور و فکر سے کرتے ہیں، اور جس بات کو اپنے طور پر صحیح سمجھتے ہیں اس کو بے تکلف قلمبند کر دیتے ہیں۔ وہ ان شعرا میں نہیں ہیں جو ماضی کی صحت مند روایات سے صرف اس لئے بیزار ہو جائیں کہ وہ عہدِ قدیم کی پیداوار ہیں یا آج کے خیالات اور بدلے ہوئے رجحانات سے باوجود صالح اور مفید ہونے کے اس لئے کنارہ کش ہو جائیں کہ یہ عہدِ قدیم کے مطابق نہیں یا بزرگوں نے اُن کو کہیں قلم بند نہیں کیا، محروم کا شعور پابند روائتی رسوم و قیود نہیں لیکن جہاں کہیں آج کے شعرا کے کلام میں بے راہ روی اُن کو نظر آتی ہے اس پر بزرگانہ انداز میں صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں جیسے اُن کا دل کُڑھتا ہے اور بے چین ہو کر کہہ اُٹھتے ہیں۔

آزاد قید و بند سے ہیں آج اہلِ فن — پابند یعنی کوئی کسی بات میں نہیں
جو جس کے جی میں آئے لکھے اور چھاپ دے — کچھ فرق شعر اور خرافات میں نہیں

اِس وسیع النظری نے اُن کے کلام کو ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔

یوں تو شاعری کے لئے ہی الفاظ اور زبان کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے لیکن زبان کا خیال رکھنا اور صحتِ الفاظ کا لحاظ رکھنا غزل کے لئے اور بھی زیادہ

ضروری ہے۔ اگر غزل گو بازارِ غزل میں صرف اسی جنس کے بھروسے پر زندہ رہنا چاہتا ہے تو کامیاب ہونا مشکل ہے۔ وقتی شہرت اور سستی ہر دلعزیزی ممکن ہے اس مال کی قیمت میں مل جائے مگر دیرپا اثر نصیب ہونا مشکل ہے۔ اس کے لئے زبان کے ساتھ ساتھ بلند خیالی کو بھی کلام میں جگہ دینی پڑے گی۔ محروم صاحب کے کلام میں ہر جگہ آپ کو منتخب الفاظ اور حسین اندازِ بیان ملے گا، اور ہر جگہ تو نہیں مگر اکثر فکری عنصر کی آمیزش اور ذاتی تجربات خوبصورتی کے ساتھ اشعار میں جلوہ گر نظر آئیں گے۔

مثال کے لئے چند اشعار دیکھتے چلیے۔

ہم کیوں کریں ذلیل جبینِ نیاز کو
شایانِ سجدہ جب نہ کوئی آستاں ملے

بھٹکا ہے مجھ کو وادیٔ وہم و گماں میں کیوں
جس میں ترا سُراغ نہ اپنی خبر ملے

یوں زندگی سے مل کے جوانی جدا ہوئی
جیسے کسی سے کوئی سرِ رہگذر ملے

اِس میں اے معمارِ ہستی مصلحت تھی کون سی
ایسا قصرِ خوشنما اور ریت کی بنیاد پر

بے مہریٔ بُتاں سے خدا یاد آگیا
محروم کس کو یاد کروگے خدا کے بعد

عقل کو کیوں بتائیں عشق کا راز
غیر کو راز داں نہیں کرتے

ہے ابتدائے شام سے ظلمات کا سفر
ہوتی ہے دیکھئے شبِ غم کی سحر کہاں

اس مجموعے میں آپ کو محروم کی غزلیں تین دَور میں منقسم ملیں گی جس سے اُن کے کلام و ذہن کے ادبی و فنّی ارتقا کا اندازہ ہوگا۔ آپ بھی غالباً مجھ سے متفق ہوں گے کہ محروم صاحب کو زبان و بیان کا ہمیشہ خیال رہا ہے۔ وہ غزل کے مزاج کو پُوری طرح سمجھ کر اس میدان میں آئے تھے۔ اس کی نزاکت و لطافت سے ایسی ذہنی وابستگی تھی جو روز افزوں ترقی کے ساتھ کلام میں جلوہ گر ہوتی رہی۔

ابتدائی کلام میں کسی قدر رنگینی و شوخی زیادہ ہے تو تعجب کی بات نہیں بلکہ اقتضائے فطرت ہے۔ غزل درحقیقت اپنی فطرت کے لحاظ سے جوانی کا ہر قدم پر مطالبہ کرتی ہے۔ جوانی خود غزل بن کر آتی ہے۔ پورا ماحول اپنے ساتھ لاتی ہے۔ شاعر کو مجبور کرتی ہے کہ محسوسات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر اصنافِ سخن کے لحاظ سے غزل بنا دے۔ غرض جوانی و غزل کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ محروم نے اس عہد کی شاعری کو اپنے جذبات و تجربات سے اس منزل پر رکھنے کی کوشش کی ہے جو اس کا فطری تقاضہ تھا۔ بعد کے کلام میں یہ خصوصیت نسبتاً کم ہوتی گئی ہے۔ غمِ دنیا و غمِ جاناں نے متوازن ہوکر کلام میں حسین اعتدال پیدا کر دیا ہے۔ اپنے سوا وہ کچھ دوسروں کا خیال کرنے لگے ہیں۔ وطن، رہنمایانِ قوم، غمِ دوراں کے محسوسات اُبھرنے لگے ہیں۔ اور غزل میں جتنی گنجائش ہوسکتی ہے ان جذبات کو جا بجا خوبی سے سموتے جاتے ہیں۔ آخر میں سب سے بڑا غمناک واقعہ تقسیمِ ہند کا سامنے آتا ہے۔ وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ سانحہ ایک داغ بن کر ان کی غزلوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن وہ داغ نفسیاتی اعتبار سے تکلیف دہ جتنا بھی رہا ہو۔ مگر میرے خیال سے ان کے کلام کو اور زیادہ روشن کر گیا ہے۔ اشعار میں سوز و گداز ہمیشہ سے زیادہ ہو گیا۔ تجربات وسیع تر ہو گئے۔ محروم صاحب عمر کی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ حسن و عشق کے رموز، معشوق سے

چھیڑ چھاڑ اور اس قسم کے دوسرے عناصر جو ہیجانی کیفیت پیدا کر کے ایک طبقہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں، اُن کی غزلوں میں کم نظر آئیں، کیونکہ بجائے اس کے صحت مند اور حکیمانہ خیالات زیادہ ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے اس دور کی غزلوں میں کچھ لوگوں کو پہلے ادوار کی سی کیفیت کم نظر آئے۔ کیونکہ نصیحت و پند بذاتہٖ عموماً تلخ ہوتے ہیں، لیکن حقیقت اور کار آمد باتوں پر نظر رکھنے والے اس کمی کو کوئی خاص کمی نہ سمجھیں گے، بلکہ احساس و شعور کی بڑھتی لہر سے مستفید ہونے کی مسرت حاصل کریں گے۔

سیّد اعجاز حسین

دورِ سوم
۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک

حُسن ہے جانِ غزل اور عشق ایمانِ غزل
کائناتِ شعر میں ہے خُوب سامانِ غزل

سچ کہا ہے "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب"
جُز غزل دیکھا نہیں ہے اور عنوانِ غزل

رِند ہے ساغر بدست اور پارسا مستِ الست
سایہ افگن سر پہ دونوں کے ہے دامانِ غزل

تلخیٔ پند و نصائح بھی گوارا ہو گئی
حضرتِ واعظ بھی ہیں ممنونِ احسانِ غزل

نغمہ آرائی پہ ہوتا ہے جو مائل فلسفی
وہ بھی کھچتا ہے سوئے صحنِ گلستانِ غزل

نغز گوئی میں عدیم المثل ہیں جوشؔ و فراقؔ
پہلے حسرتؔ تھا، جگرؔ ہے آج سلطانِ غزل

گو نہیں حاصل غزل گوئی میں مجھ کو دسترس
میں بھی ہوں محرومؔ دل سے قائلِ شانِ غزل

۱

خزاں سے پیشتر سارا چمن برباد ہوتا ہے

غضب ہوتا ہے، جب خود باغباں صیاد ہوتا ہے

تجھے اس پر گمانِ نغمہ اَے صیاد ہوتا ہے

قفس میں نالہ کش مُرغِ گلستاں زاد ہوتا ہے

خوشی کے بعد اک تُو ہی نہیں ہے مبتلائے غم

یُونہی اکثر جہاں میں اَے دلِ ناشاد ہوتا ہے

روا رکھتا ہے وہ بیداد پہلے اپنی فطرت پر

جو انساں دوسرے پر مائلِ بیداد ہوتا ہے

جو کرتا ہے نثارِ نوعِ انساں اپنی ہستی کو

وہ انساں افتخارِ عالمِ ایجاد ہوتا ہے

مرے اشعار کی توصیف ہوتی ہے مرے ہوتے

نہیں معلوم میرے بعد کیا ارشاد ہوتا ہے

نہ کر محروم تُو فکرِ سخن، اب فکرِ عُقبےٰ کر

نوا پرداز بزمِ شعر میں آزادؔ[1] ہوتا ہے

[1] جگن ناتھ آزادؔ فرزندِ مصنّف

۲

گو اس سے اِضطراب میں ہے جانِ زندگی
پھر بھی یہ ذرۂ عشق ہے شایانِ زندگی

اچھا ہوا کہ موت نے مجھ کو مٹا دیا
میں داغِ ننگ تھا سرِ دامانِ زندگی

نغمے سمجھ رہا ہے انھیں نا سخن شناس
مجموعہ مرثیوں کا ہے دیوانِ زندگی

آہوئے تشنہ اور فریب سرابِ دشت
انسان اور عیشِ گریزانِ زندگی

پایا کہیں نہ گوہرِ مقصود کا نشاں!
چھانی بہت ہے خاکِ بیابانِ زندگی

تسکینِ دل بہ جز غمِ اُلفت کہیں نہیں
ثابت ہوا کہ ذرہ ہے درمانِ زندگی

محروم کس کے نوکِ قلم کا ہے شاہکار
افسانۂ فراق بہ عنوانِ زندگی

ارماں سمٹ کے دیدۂ بسمل میں آ گئے
بارے کبھی تو منظرِ قاتل میں آ گئے

"نے مژدۂ وصال نہ نظّارۂ جمال"
دل سے گئے نئے کب' جو کہوں دل میں آ گئے

احساسِ کمتری سے ہیں شاید یہ سرنگوں
خورشید و ماہ کس کے مقابل میں آ گئے

ساحل نے گر کے غرق سفینے کو کر دیا
سمجھے تھے ہم کہ دامنِ ساحل میں آ گئے

نکلیں گے جیسے چاند گہن سے نکل پڑے
انوارِ حق جو سایۂ باطل میں آ گئے

آوارگانِ دشتِ بلا پر بھی اک نظر
چشمِ اُمید لے کے جو محفل میں آ گئے

محرومؔ اب تو جاگئے غفلت کی نیند سے
ایامِ زیست آخری منزل میں آ گئے

۴

ارزاں سمجھ، اگر غمِ اُلفت گراں ملے
نقصاں نہیں، اگر عوضِ نقدِ جاں ملے

اے راہرو، قدم نہ رکھ اس پر غرور سے
یہ خاک وہ ہے جس میں کئی کارواں ملے

مل جائیں کاش مجھ کو کہیں، او رہیں کہوں
ڈھونڈا کہاں کہاں تھیں اور تم کہاں ملے

ہوں دشت و کوہ یا چمن، اے مادرِ وطن
جنّت ہے، تیرا سایۂ دامن جہاں ملے

اس چند روزہ زیست سے جاں ہے عذاب میں
کیوں کر گئے، جو زندگیِ جاوداں ملے

ہم کیوں کریں ذلیل جبینِ نیاز کو
شایانِ سجدہ جب نہ کوئی آستاں ملے

جب تک خیالِ حُسن سے آباد ہو نہ دل
ممکن نہیں زبان کو حُسنِ بیاں ملے

ملتے رہے ہیں ہم شُعرائے کرام سے
کم اہلِ دل تھے، بیشتر اہلِ زباں ملے

محروم ہو گیا سفرِ زندگی تمام!
اب دیکھیئے قرار کی منزل کہاں ملے

۵

بدل گئی ہے کچھ ایسی ہوا زمانے کی
خُوشی کسی کو نہیں فصلِ گُل کے آنے کی

نہ بچ سکا یہ کبھی اِنقلاب کی زد سے
بشر کے ساتھ رہیں گردشیں زمانے کی

دلِ ستم زدہ پر بجلیاں گراتی ہے
قفس میں یاد جو آتی ہے آشیانے کی

جو نیک نام رہا زندگی اُسی کی ہے
وہ کیا جیا جو کسی سے نہ کر سکا نیکی

عدم کو جائیں ہمیں، اُن سے جا ملیں محروم
ہمیں سُنا کے گئے ہیں جو پھر نہ آنے کی

۶

نہ سوز و ساز کے پیری میں چھیڑ افسانے
سحر ہے، شمع کہاں اب؟ کہاں ہیں پروانے

بگڑ گئے ہیں وہ نقشے، بدل گیا عالم
اُجڑ گئے ہیں خیالات کے پری خانے

خزاں فسردگی کس کی ہے کوئی کیا سمجھے
بہار کس کا تبسم ہے کوئی کیا جانے

خرد پناہ اسیرِ اُمید و یاس رہے
نجات پا گئے ان اُلجھنوں سے دیوانے

کہیں نہ بادہ کشوں کے یہ دل ہوں اے ساقی
جو میکدے میں پڑے ہیں شکستہ پیمانے

گذشتہ دَور کی اے یاد پھر نہیں آنا
اگر یونہی تجھے آنا ہے ہم کو تڑپانے

بہت عزیز تھے غربت کے سبزہ زاروں سے
جنوں نواز وہ اپنے وطن کے ویرانے

جو دل کی بات زباں تک نہ آئے تو اچھا
کہ اس سے اپنے بھی اکثر ہوئے ہیں بیگانے

دیارِ غیر ہو محروم، یا وطن اپنا
وہی ہے دوست ہمارا جو ہم کو پہچانے

۵

زوالِ حُسن کو حُسنِ نگار کیا جانے
خزاں قدم بہ قدم ہے، بہار کیا جانے

لکھا ہے اُس کے مقدّر میں اضطرابِ دوام
قرار کیا ہے دلِ بے قرار کیا جانے

نصیب راحتِ قُربِ دوام ہو جس کو
وہ لذّتِ خلشِ انتظار کیا جانے

سمجھ رہے ہیں جسے سب گناہگار یہاں
اُسی پہ ہو کرمِ کردگار، کیا جانے

کئے پہ اپنے ہو خود منفعل بشر آخر
یہی ہو جبر، یہی اختیار کیا جانے

تڑپ رہا ہوں میں اپنے گناہ گن گن کر
اسی کا نام ہو روزِ شمار، کیا جانے

کہاں یہ شامِ غریباں، کہاں وہ صبحِ وطن
یہ فرق گردشِ لیل و نہار کیا جانے

جو پاؤں توڑ کے بیٹھے سرِ رہِ منزل
وہ کب اُٹھیں گے، کوئی شہسوار کیا جانے

بایں کمالِ خرد کیوں ہے مائلِ الحاد
مقامِ جوشؔ کو مخدومِ زار کیا جانے[1]

[1] حضرت جوشؔ ملیح آبادی

۸

کہیں دُنیا میں ایسی بے بسی دیکھی نہیں جاتی[1]

کہ خود مجھ سے مری ناآگہی دیکھی نہیں جاتی

بہت مجبور ہو کر دیکھتے ہیں، گو اِن آنکھوں سے

کسی کی بندگی، بے چارگی دیکھی نہیں جاتی

فلک سے کیا ہو اُمیّدِ مسرّت باغِ عالم میں!

گُلِ شاداب کی جس سے ہنسی دیکھی نہیں جاتی

بجا ہے شکوۂ تاریکیٔ شب بھی، مگر آخر!

مہ و خورشید کی کیوں روشنی دیکھی نہیں جاتی

خوشی کی آرزو بے سود ہے اس میں، یہ دنیا ہے

جہاں انساں سے انساں کی خوشی دیکھی نہیں جاتی

یہ ہے ارشادِ حُسنِ دورِ حاضر "بند رکھ آنکھیں

اگر تجھ سے مری بے پردگی دیکھی نہیں جاتی"

اُٹھے گا آخر اے محروم کب یہ پردۂ غفلت

کھڑی ہے جو گھڑی سر پر وہی دیکھی نہیں جاتی

[1] یومِ جمہوریہ کے طرحی مشاعرہ کی غزل۔

کاہشوں سے اماں ملے نہ ملے

پھر ترا آستاں ملے نہ ملے
اب قفس ہی کو آشیاں کہیئے

راحتِ آشیاں ملے نہ ملے
دل سے رہتے ہیں مشورے دن رات

ہم سخن ہم زباں ملے نہ ملے
محوِ فریاد ہم ہیں آج کہ پھر

فرصتِ یک فغاں ملے نہ ملے
علمِ آہ سر بلند ہے آج

کل ہمارا نشاں ملے نہ ملے
تو تو بیتاب ہے مگر اے دل

ہو سکے وہ مہرباں ملے نہ ملے
یہ غزل جوشؔ[1] کو سنا ہمدم
پھر کوئی نکتہ داں ملے نہ ملے

[1] شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی

عارض کے پاس زُلفِ سیہ فام دوش پر
وہ ہیں لئے ہوئے سحر و شام دوش پر

کیا احتیاجِ جام، وہیں مُنہ لگا نہ دوں؟
ساقی سبُوئے مے کو ذرا تھام دوش پر

عالم ہے دوشِ گردشِ ایّام پر سوار
یا ہے سوار گردشِ ایّام دوش پر

مرغِ چمن ہے نغمہ سرا ایک کُنج میں
صیّاد اک طرف ہے لئے دام دوش پر

دنیا کے پیار نے مجھے غافل بنا دیا
سو جائے جیسے طفل بہ آرام دوش پر

جی چاہتا ہے جانبِ صحرا نکل چلیں
محروم بوجھ ہیں یہ در و بام دوش پر

۱۱

وہ دل کہاں ہے، اہلِ نظر دل کہیں جسے
یعنی نیازِ عشق کے قابل کہیں جسے
زنجیرِ غم ہے خود مری خواہش کا سلسلہ
یا زُلفِ خم بہ خم کہ سلاسل کہیں جسے؟
ملتا ہے مشکلوں سے کسی کے حضور کا
وہ ایک لحظہ زیست کا حاصل کہیں جسے
کشتیِ شکستگانِ یمِ اضطراب کو
تیرا ہی ایک نام ہے ساحل کہیں جسے
باقی نہیں فروغ بجز سوز و سازِ عشق
شمعِ حیات درخورِ محفل کہیں جسے

اُس دل کو شاد رکھنے کی خدمت مِلی مجھے
غمہائے روزگار کی منزل کہیں جسے

اِس دَورِ قدر دانِ سخن میں یہ اتّفاق؛
شاعر وہی ہے رونقِ محفل کہیں جسے

محرومِ چاکِ سینۂ ہر گُل میں ہے وہ چیز
تاثیرِ نالہ ہائے عنادِل کہیں جسے

۱۲

دستِ خرد سے پردہ کُشائی نہ ہو سکی
حُسنِ اَزَل کی جلوہ نمائی نہ ہو سکی

رنگِ بہار دے نہ سکے خارزار کو
دشتِ جنوں میں آبلہ سائی نہ ہو سکی

اے دل، تجھے اجازتِ فریاد ہے، مگر
رُسوائی ہے، اگر شنوائی نہ ہو سکی

مندر بھی صاف ہم نے کئے، مسجدیں بھی پاک
مشکل یہ ہے کہ دل کی صفائی نہ ہو سکی

"فکرِ معاش و عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں"
اِن مشکلوں سے عُہدہ برآئی نہ ہو سکی

۱

غافل نہ تجھ سے اے غمِ عقبیٰ تھے ہم مگر
دامِ غمِ جہاں سے رہائی نہ ہو سکی

منکر ہزار بار خدا سے ہوا بشر
اک بار بھی بشر سے خدائی نہ ہو سکی

خود زندگی بُرائی نہیں ہے تو اور کیا
محروم جب کسی سے بھلائی نہ ہو سکی!

۱۳

نگاہِ شوق جو حسرت بھری نہیں ہوتی[1]
تو اس سے دل میں بپا ابتری نہیں ہوتی

جو دلبری میں وفا پروری نہیں ہوتی
فریب ہوتی ہے، وہ دلبری نہیں ہوتی

شعاعِ نیّرِ تاباں اگر کرم نہ کرے
نجومِ شب میں ضیا گستری نہیں ہوتی

بلند شہپرِ صرصر پہ وہ ہزار اُڑے
نصیبِ ذرّہ بلند اختری نہیں ہوتی

سرِ نیاز وسیلہ ہے سرفرازی کا
قبولِ اہلِ نظر خودسری نہیں ہوتی

[1] مشاعرۂ یومِ برق کی طرحی غزل

نہ پوچھ لذتِ دردِ نہاں ہے کیا ہمدم
یہ دل کی بات ہے، لب پر دھری نہیں ہوتی

بہ غفلت اپنی حقیقت کو بھول جائے بشر
زیادہ اس سے کوئی کافری نہیں ہوتی

سخنوری بھی عجب چیز ہے مگر محروم
بغیر حُسنِ عمل برتری نہیں ہوتی

۱۴

نہ وہ دل[1] ہے نہ دل کے ولولوں میں جان باقی ہے
یہ حیرت ہوں کہ پھر بھی زیست کا امکان باقی ہے
ہماری زندگی کا کچھ نہ کچھ سامان باقی ہے
مذاقِ دردِ دل یعنی بہ ہر عنوان باقی ہے
وطن کا نام مٹ سکتا نہیں تاریخِ عالم سے
بزرگانِ سلف جب تک تمھاری آن باقی ہے
رہے گا یہ ہمارا دَور بھی ننگِ وطن جب تک
وطن کی سرزمیں پر ایک بھی انسان باقی ہے
ہزاروں مشکلیں آساں ہوئیں، لیکن مرے دل میں
جو مشکل ہو نہیں سکتی کبھی آسان باقی ہے

[1] یوم برق کی طرحی غزل

خدا جانے ہماری زندگی احسان ہے کس کا
کہ جب تک زندگی موجود ہے احسان باقی ہے

بھلا ہے صاحبِ زر اور بُرا ہے مفلسِ بے زر
بھلے کی اور بُرے کی اب یہی پہچان باقی ہے

کیا ہے خون لاکھوں بے گناہوں کا مگر پھر بھی
اہنسا برہمن کی ، شیخ کا ایمان باقی ہے

"لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی"
یہ مانا عالمِ اجسام فانی ، جان باقی ہے

غزل محروم سے اِس مصرعۂ رنگیں نے لکھوائی
"گلستانِ ادب پر برق کا احسان باقی ہے"

پُجاری رام کے کردار میں راون کے پیرو ہیں
کنھیّا کے وطن میں کنس کی سنتان باقی ہے

نظر اُٹھا دلِ ناداں، یہ جستجو کیا ہے[1]
اُسی کا جلوہ تو ہے اور روبرو کیا ہے

کسی کی ایک نظر نے بتا دیا مجھ کو
سرورِ بادۂ بے ساغر و سبو کیا ہے

قفس عذاب سہی، بلبلِ اسیر، مگر
ذرا یہ سوچ کہ وہ دامِ رنگ و بو کیا ہے

گدا نہیں ہیں کہ دستِ سوال پھیلائیں
کبھی نہ آپ نے پوچھا کہ آرزو کیا ہے

نہ میرے اشک میں شامل، نہ اُن کے دامن پر
میں کیا بتاؤں اُنھیں خونِ آرزو کیا ہے

سخن ہو سمع خراشی تو خامشی بہتر
اثر کرے جو نہ دل پر، وہ گفتگو کیا ہے

بُرا تو کہتے ہو محرومؔ شاعری کو، مگر
نہ ہو یہ چیز تو حضرت کی آبرو کیا ہے

[1] یومِ مرزا غالب کی طرحی غزل

ہو خاک تسکیں کہ موت کے بعد اک نئی زندگی ملے گی
ابھی سے گویا یہ فرض کرلوں کہ پھر مصیبت وہی ملے گی

میں عقل کی راہ پر نہ چلتا اگر مجھے اس کا علم ہوتا
کہ صبحِ ہر آگہی سے پیوستہ شامِ ناآگہی ملے گی

ریاضِ عالم میں تجھ کو اے دل جو آرزوئے شگفتگی ہے
کلی کو جیسے پسِ شگفتن ملی ہے پژمردگی ملے گی

یہ نو بہ نو ظلمتیں کہ جس میں بھٹکتی پھرتی ہے آدمیت
چھٹیں گی کب اے خدائے برتر کب اُس کو پھر روشنی ملے گی

ہجومِ افکار، شامِ غربت، بجھا ہوا دل، ملالِ ہجرت
کنارِ جمنا ہو لاکھ دلکش تلکؔ ہمیں کیا خوشی ملے گی

ے شاعر کے نام کی تخفیف ہے

تغافل بھی نہیں بھولا مجھے چشمِ عنایت بھی
کسی کا شکر بھی میری زباں پر ہے، شکایت بھی

مزے کی چیز ہے ترکِ تمنّا اور ریاضت بھی
مگر کچھ کم نہیں ہے لذّتِ دردِ محبت بھی

فنا پیشِ نظر ہے اور روا ہے چشمِ عبرت بھی
کئے جاتا ہے لیکن کام اپنا خوابِ غفلت بھی

دلِ انساں نہیں رہتا کبھی خوش ایک حالت سے
رہے اک حال پر تو رنج ہو جاتی ہے راحت بھی

دوائے تلخ بچوں کو ہے دیتی مادرِ گیتی
نہیں حکمت سے خالی تلخیِ دورِ مصیبت بھی

کوئی سوتا ہو جیسے ڈوبتی کشتی کے تختے پر
اگر کچھ ہے تو بس اتنی ہے اس دُنیا کی راحت بھی

خلش یادِ احبا کی نہ ہو محروم اگر دل میں!
مسافر کے لئے صبحِ وطن ہے شامِ غربت بھی

جب سے تو ہوئی رخصت اے وفا زمانے سے
اہلِ دل اُٹھا بیٹھے ہاتھ دل لگانے سے

دل ابھی پشیماں ہے جان کے نہ جانے پر
ورنہ کچھ نہیں بگڑا آپ کے نہ آنے سے

اِس شراب خانے سے دُور ہے بہت مسجد
شیخ جی یہاں پہنچے آپ کس بہانے سے

بختِ لالہ و گُل میں امتیاز ہے، ورنہ
داغ بھی ملے، زر بھی غیب کے خزانے سے

کیا خطا گلستاں کی، ہم کہیں بنا لیتے
برقِ بے اماں کو بھی لاگ آشیانے سے

نفس عیش و عشرت سے مطمئن تو کیا ہوگا
آگ اور بھڑکے گی تیل کے گرانے سے

زندگی سے ترساں ہے موت اے تِلکؔ[1] شاید
منہ چھپا کے آتی ہے ورنہ کیوں بہانے سے

[1] شاعر کے نام کی تخفیف ہے۔

۱۹

عبث نامؔ و نشاں پر ناز کرتے ہیں جہاں والے
کہ ہو کر نقشِ باطل مٹ گئے نام و نشاں والے

اسیرانِ قفس کو دور تر اے باغباں لے جا!
کہ بے فکری سے گلچھرے اُڑائیں آشیاں والے

ذرا اے قصر و ایواں کے مکینو! غور فرماؤ
رہیں گے تا بکے پامالِ حرماں آستاں والے

ہے قائم اُن کے سر پر بھی تو آخر آسماں کوئی
بہت اونچے سہی اہلِ زمیں سے آسماں والے

روا اتنا ستم ہرگز نہ رکھتے بے زبانوں پر
زبانِ دل سے بھی واقف اگر ہوتے زباں والے

خموشی کو تری اے برقؔ مدّت ہو گئی، لیکن
ترا دم آج تک بھرتے ہیں سب حُسنِ بیاں والے

فضائے ہند نغموں سے ترے گونجے گی صدیوں تک
"ہمیشہ یاد رکھیں گے تجھے ہندوستاں والے"

لہ بہ تقریب یومِ برقؔ مرحوم

۲۰

تجھ کو ہے ذوقِ سکوں اے دلِ بیتاب ابھی

صُبح ہے اور ہے تُو منتظرِ خواب ابھی

ابھی اندیشہ تاراجِ خزاں باقی ہے

وقت ہنسنے کا نہیں اے گُلِ شاداب ابھی

دلِ مہتاب ہے گو برہمیٔ بزم سے داغ

بادہ کش ہیں گرِدِ جلوۂ مہتاب ابھی

فکرِ تعمیر بھی غافل نہیں، بے لیس ہے مگر

کہ جنوں خیز ہیں تخریب کے اسباب ابھی

جس سے دُنیا کی جراحت کا مُداوا ہو جائے

نوشدارُو وہ زمانے میں ہے نایاب ابھی

جس کے ہر جُرعہ میں ہو کیفِ مساوات نہاں
مے کدوں میں ہی نہیں ملتی وہ مئے ناب ابھی

قیس و فرہاد کی تقلید پہ مرنے والے
دشت و کہسار میں ہیں نقش وہ آداب ابھی

فیضِ قدرت میں کمی کوئی نہیں ہے لیکن
پھر بھی محتاج ہے یہ عالمِ اسباب ابھی

مجھ سے محروم تقاضائے غزل ہے بے سُود
کہ مری فکر میں ہے نوحۂ پنجاب ابھی

کروں میں کس طرح شکوہ کسی سے دل فگاری کا

کہ دل بھونکا ہے، سو سو زخم کھا کر زخمِ کاری کا

گلستاں پر بڑا احسان تھا ابرِ بہاری کا

نہ ہوتا اُس کے دامن میں جو سامان آبیاری کا

بہاریں بار بار آئیں، چمن میں گُل کھِلے لاکھوں

نہ آیا ایک بھی جھونکا اِدھر بادِ بہاری کا

کنارِ رشدہ گذری ہے مری اِک عُمر اے شبنم

سلیقہ مجھ کو دریا نے سکھایا اشکباری کا

غموں کے جمع کرنے میں ضرر ہے اے دلِ ناداں

کہ عہدِ نو ہے دشمن شیوۂ سرمایہ داری کا

عزیزو، دوستو، وہ وقت بھی اب آنے والا ہے

یقیں جب آئے گا تم کو مری بے اختیاری کا

ریاکاری میں اے محرِ دم تجھ سا بھی کوئی ہوگا

کہ ہر محفل میں چرچا ہے تری پرہیزگاری کا

۲۲

بار ہا حیرت کے عالم میں جہاں گُم ہو گیا
اس پہ کیا حیرت جو کوئی بے نشاں گُم ہو گیا

جذب ہو کر رہ گئیں دل میں ہزاروں حسرتیں
جس طرح دامن میں ہر اشکِ رواں گُم ہو گیا

فکرِ جاں کیا کیجئے جب موت سر پر آ گئی
ذکرِ دل سے کیا غرض، جب دلستاں گُم ہو گیا

کشتیٔ اُمّید اپنی دُور ساحل سے رہی
جب چلی بادِ موافق، بادباں گُم ہو گیا

کس بہارِ ناز کے جلوؤں سے ہو کر بدحواس
ڈھونڈتی پھرتی ہے بُلبل، آشیاں گُم ہو گیا

عشق نے سو بار پیمانِ وفا باندھا تو کیا
حُسنِ فانی بن کے زیبِ داستاں گم ہو گیا

چشمِ حیرت بن گیا ہر حلقہ دامِ زیست کا
طائرِ جاں ہو کے آخر پر فشاں گم ہو گیا

کیا کرے کوئی حیاتِ جاوداں کی آرزو
خضر مانندِ حیاتِ جاوداں گم ہو گیا

بیدلی میں کٹ گئی محروم ساری زندگی
کیا کہیں دل کس طرح؟ کب؟ اور کہاں گم ہو گیا

۲۳

اسیرِ حلقۂ گیسوئے خوباں ہو نہیں سکتا
وہ دل، تُو جس کو تسکیں دے، پریشاں ہو نہیں سکتا

تری قُدرت سے ہوتا ہے، تری حکمت سے ہوتا ہے
کوئی پتھر کہیں لعلِ بدخشاں ہو نہیں سکتا

محبت ہو کہ نفرت ہو، یہ دل کے کھیل ہیں سارے
نہ چاہے دل تو کوئی دشمنِ جاں ہو نہیں سکتا

چھپا لیتے ہیں بادل جہرہ مہ کو اپنے دامن میں
چراغِ داغِ الفت زیرِ داماں ہو نہیں سکتا

مصیبت ہی سے قدرِ عافیت ہوتی ہے دنیا میں
نہ پیش آیا ہو جس کو غم وہ شاداں ہو نہیں سکتا

وطن کوئی ہو عزّت جوہر قابل سے بڑھتی ہے
گُلِ صحرا کا ہمسر خارِ بُستاں ہو نہیں سکتا

دلِ انساں ہے محتاجِ ضیائے آفتابِ عشق
بغیر اس کے کسی صورت درخشاں ہو نہیں سکتا

اسی سے اختیار و جبر کا مفہوم کُھلتا ہے
جو ہونا چاہتا ہے کوئی انساں ہو نہیں سکتا

مٹایا تو نے اے محروم ہر اک نقشِ باطل کو
جُدا دل سے ترے کیوں داغِ حرماں ہو نہیں سکتا

۲۴

ہم اپنی ذات کے دشمن ہیں خود اغیار سے بڑھ کر
کہ اپنا نفس ہے ہر دشمنِ عیّار سے بڑھ کر

کبھی اے بُت شکن سوچا بھی ہے، دیکھا بھی ہے تونے
کہ بُت کوئی بڑا کم ہے بُتِ پندار سے بڑھ کر

ہراک آزار سے محفوظ ہو انساں اگر سمجھے
کہ ہے رسمِ دل آزاری ہراک آزار سے بڑھ کر

دلِ غمدیدہ کو سیرِ چمن کب راس آتی ہے
خلش گر برگِ گُل ہوتا ہے نوکِ خار سے بڑھ کر

سخن سنجی کو اے محروم ہم اپنا ہُنر سمجھے
نہ آئی یہ سمجھ کردار ہے گفتار سے بڑھ کر

کچھ بُری بات نہیں صاحبِ ایماں ہونا
اگر ایمان سے مطلوب ہو انساں ہونا

برگ ہائے گلِ تر کا یہ پریشاں ہونا
جُرم ہے گُل کدۂ دہر میں خنداں ہونا

جب کسی غنچے کو کھِلتے ہوئے دیکھا میں نے
آگیا یاد وہیں دل کا پریشاں ہونا

ہو گیا میری پریشاں نظری کا باعث
جلوۂ حُسن کا ہر سمت فراواں ہونا

اہلِ وحشت کا ٹھکانا بھی کہیں تو ہوتا
نہیں بے صرفہ بیاباں کا بیاباں ہونا

دمِ غمِ عشق کا بھرتے ہوئے نالے کرنا
آرزو دہ رُو کی اور طالبِ درماں ہونا

باعثِ حیرتِ اربابِ سخن ہے محروم
عہدِ پیری میں تمھارا یہ غزلخواں ہونا

۲۶

یہی انجامِ مسرت ہے، کہ خنداں ہو کر
شاخساروں سے گرے پھول پریشاں ہو کر

دیکھئے، حُسن کا اعجاز، کہ بے جاں ہو کر
آئینہ دیکھ رہا ہے اُنھیں حیراں ہو کر

قیس و فرہاد کے انجام پہ روتا ہے دل
غمِ جاناں نے رُلایا غمِ دوراں ہو کر

پھوٹ نکلا کہیں پھولوں میں کہیں تاروں میں
دل کی تسکیں نہ ملی حُسن کو پنہاں ہو کر

رہ گئی عالمِ حیرت میں دمِ نظّارہ
نگہِ شوق نقابِ رُخِ جاناں ہو کر

دیکھتے دیکھتے آباد ہوئے ویرانے
دل کی بستی نہ بسی پھر کبھی ویراں ہو کر

پھر وہیں شوق اُسے کھینچ کے لے آتا ہے
جو تری بزم سے جاتا ہے پشیماں ہو کر

زندگی یوں تو ہے لاریب ہر انساں کو عزیز
زندگی اُن کی ہے جیتے ہیں جو انساں ہو کر

عُمرِ فانی نے دیا ساتھ مگر اے محروم
رنج و غم، درد و الم، حسرت و ارماں ہو کر

۲۷

تنِ خاکی رہے گا ہمرہِ انوارِ جاں کب تک
چلے گی کارواں کے ساتھ گردِ کارواں کب تک

دلِ وارستہ کی وارستگی کا امتحاں کب تک
جفائے دشمناں کب تک، وفائے دوستاں کب تک

اِدھر بھی ایک جھونکا اے ہوائے فصلِ آزادی
رہوں زنجیریِٔ اندیشۂ سود و زیاں کب تک

نسیمِ فصلِ گُل آئی نہ ان بارہ مہینوں میں
رہے گا باغ میں، اے باغباں! دورِ خزاں کب تک

نہ کیوں ہم دیدۂ خونبار سے گُلکاریاں کر لیں
رہیں آخر بہ اُمّیدِ بہارِ گُلستاں کب تک

وطن کی یاد مٹتے مٹتے مٹ جاتی ہے غُربت میں
قفس میں تابشِ داغِ فراقِ آشیاں کب تک

اجل آ کر بلند و پست کو ہموار کر دے گی

کوئی بالا نشیں کب تک، کوئی پستی نشاں کب تک

سبک ہے یا گراں، اے زندگی! آخر ہے تُو اپنی

تجھے اپنائیں گے، تجھ سے رہیں گے سرگراں کب تک

اُجاڑی جائے گی کب تک زمیں از بہرِ آبادی

لڑی جائیں گی جنگیں از پئے امن و اماں کب تک

صِلہ حُسنِ عمل کا خونِ دل ہے اس زمانے میں

مرے کام آئے گی رنگینیٔ حُسنِ بیاں کب تک

وہی اک حسرتِ ناکام ہے اور اس کا رونا ہے!

کئے جاؤ گے محروم اس کو زیبِ داستاں کب تک

۲۸

دل اگر شائستۂ دردِ نہاں پیدا کریں
ہر غمِ جاں کاہ سے آرامِ جاں پیدا کریں

کفر و دیں میں اتحادِ جاوداں پیدا کریں
نالۂ ناقوس سے بانگِ اذاں پیدا کریں

امتیازِ این و آں سے "این و آں" دونوں تباہ
اب نہ ہرگز امتیازِ این و آں پیدا کریں

ایک ہم ہیں، اپنے گلشن کو جو صحرا کر چکے
ایک وہ ہیں دشت میں جو گلستاں پیدا کریں

آدمیّت کو نہ چھوڑیں ہم، غنیمت ہے یہی
کون کہتا ہے صفاتِ قدسیاں پیدا کریں

جو محبّانِ وطن شانِ وطن پر مر مٹے

خاک سے اُن کی نیا ہندوستاں پیدا کریں

دُور دنیا سے کہیں اے طبعِ مضموں آفریں

اک خیالی عالمِ امن و اماں پیدا کریں

نکتہ چینی سے نہ باز آئیں گے ہرگز نکتہ چیں

لاکھ اے محرومؔ! ہم حُسنِ بیاں پیدا کریں

کسی کی یاد کو ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
اُسی کو راحتِ جاں اور سکونِ دل سمجھتے ہیں

سہارا ہے کہاں یارب ترے کشتی شکستوں کا
نکل آتی ہے موج آخر جسے ساحل سمجھتے ہیں

دلِ غمدیدہ روتا ہے تری صحرا نوردی پر
مگر اے قیس ہم لیلیٰ کو بھی محمل سمجھتے ہیں

یہ ہے دورِ حقائق سحر و افسوں ہو گئے باطل
مگر کم ہیں جو سحرِ حسن کو باطل سمجھتے ہیں

کہاں ذرّہ، کہاں خورشید، خوش فہمی ہے یہ اپنی
کہ خود کو جلوہ گاہِ دوست کے قابل سمجھتے ہیں

عدم ہے اک نفس کا فاصلہ ہستی سے، لیکن ہم
وہ غافل ہیں کہ اس کو دور کی منزل سمجھتے ہیں

کبھی محروم ہم بھی زندگی پر جان دیتے تھے
مگر اب موت سے اس کو سوا مشکل سمجھتے ہیں

وہ وعدہ استوار کبھی ہے کبھی نہیں
ہم کو بھی اعتبار کبھی ہے، کبھی نہیں

یہ دہر سازگار کبھی ہے کبھی نہیں
اُمّید ہمکنار کبھی ہے، کبھی نہیں

ہم رہروِ قدیم ہیں اور جانتے ہیں خوب
ہموار رہگذار کبھی ہے، کبھی نہیں

اس کو عیاں کہیں کہ نہاں، یا کچھ اور ہی
جو راز آشکار کبھی ہے، کبھی نہیں

ہو دوست سے توقّعِ لطفِ دَوام کیا
جب دل پہ اختیار کبھی ہے، کبھی نہیں

ظالم تمام عمر رہا دل کے آس پاس
اک غم جو خوشگوار کبھی ہے، کبھی نہیں

محرومِ طبعِ شاعرِ فطرت نگر رواں
مانندِ جوئبار کبھی ہے، کبھی نہیں

۳۱

ہجراں کی شب جو درد کے مارے اُداس ہیں
اُن کی نظر میں چاند ستارے اُداس ہیں

آنکھیں وہ پھر گئیں کہ زمانہ اُلٹ گیا
جیتے تھے جو نظر کے سہارے اُداس ہیں

کیا ہیر اب کہیں ہے نہ رانجھے کا جا نشیں
کیوں اے چناب! تیرے کنارے اداس ہیں

بہتر ہے، ہم بھی چشمِ جہاں بیں کو موند لیں
دُنیا کے اب تمام نظارے اداس ہیں

محرومؔ، کیا کلام بھی اپنا فنا ہوا!
کیوں ہم کو کھو کے دوست ہمارے اداس ہیں

۳۲

گھبرائیے کیوں؟ زندگی بے کیف اگر ہے

آخر شب تاریک کا انجام سحر ہے

وہ شام کی صورت ہے نہ وہ رنگ سحر ہے

کس کوکب منحوس کا یارب یہ اثر ہے

افسانۂ غم سینۂ بلبل میں ہے فریاد

اوراق گل تر میں بہ عنوانِ دگر ہے

بے درد ہے انساں تو ہیں سب اُس کے ہنر عیب

ہے دل میں اگر درد تو ہر عیب ہنر ہے

ثابت ہے ہر طور غمِ عشق، رمِ حُسن

آرام کو پوچھو تو اِدھر ہے نہ اُدھر ہے

مصنوع کو صانع سے جُدا کر نہیں سکتے
آئینے میں عکسِ ہُنرِ آئنہ گر ہے

روتی ہوئی آنکھوں میں ہے غرقابِ تبسّم
پنجاب ہے، دہلی میں جواب راہ گزر ہے

پھولوں میں ترا رنگ ہے کانٹوں میں تری نوک
یہ حُسن ترا ہے کہ مرا حُسنِ نظر ہے

محروم مگر عشق تمھارا ہے ریائی
فریاد میں تاثیر نہ آہوں میں اثر ہے

اِس کا گِلہ نہیں کہ دُعا بے اثر گئی
اک آہ کی تھی، وہ بھی کہیں جا کے مر گئی

اے ہم نَفَس نہ پوچھ جوانی کا ماجرا
مَوجِ نسیم تھی، اِدھر آئی، اُدھر گئی

دامِ غمِ حیات میں اُلجھا گئی اُمید
ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ احسان کر گئی

اس زندگی سے ہم کو نہ دنیا ملی نہ دیں
تقدیر کا مشاہدہ کرتے گزر گئی

انجامِ فصلِ گُل پہ نظر تھی، وگرنہ کیوں
گلشن سے آہ بھر کے نسیمِ سحر گئی

بس اتنا ہوش تھا مجھے روزِ وداعِ دوست
ویرانہ تھا نظر میں جہاں تک نظر گئی

ہر موجِ آب سِندھ ہوئی وقفِ پیچ و تاب
محرومِ حبِ وطن میں ہماری خبر گئی!

۳۴

زُلف تو نہیں، دل ہے، یہ اگر پریشاں ہے
کیوں کسی کی نظروں میں، دل لگی کا ساماں ہے

سرو پا بہ گِل ہو کر، رہ گیا ہے سکتے میں
آج صحنِ گلشن میں پھر کوئی خراماں ہے

بزمِ زندگی میں ہے دل بھی ایک افسانہ
یاس خاتمہ جس کا، شوق جس کا عنواں ہے

اپنی اپنی قسمت ہے، جوشِ فصلِ گُل ہے، اور
کوئی داغ بر دل ہے، کوئی گُل بداماں ہے

درد بھی ہے جیتے جی، آرزوئے درماں بھی
دیکھنا کہ بعد اس کے، درد ہے نہ درماں ہے

ٰ مشاعرۂ یومِ غالب کی غزل

اعتبار کیا کیجے التفاتِ دَوراں کا

آج جو گلستاں ہے، کل وہی بیاباں ہے

کارگاہِ ہستی پر اوس پڑ گئی، جب سے

سرد مہر دُنیا میں سرد خونِ دہقاں ہے

خونِ بیگناہاں ہے جب تک اُن کے دامن پر

احترام کے قابل دھرم ہے نہ ایماں ہے

اہلِ دیں تجھے کافر مانتے ہیں اے محروم

بُت پرست کہتے ہیں، یہ کوئی مسلماں ہے

۳۵

فضاؤں پر زمیں بارِ گراں معلوم ہوتی ہے
عنایت یہ تری اے آسماں معلوم ہوتی ہے

سفر کرتے ہوئے منزل بہ منزل جا رہے ہیں ہم
مجھے یہ ساری دُنیا کارواں معلوم ہوتی ہے

کوئی رازِ حقیقت سے کرے انکار نا ممکن
حقیقت گر کوئی چاہے کہاں معلوم ہوتی ہے

کبھی پانی پہ ہوتا ہے سرابِ دشت کا دھوکا
کبھی ریگِ رواں آبِ رواں معلوم ہوتی ہے

مسرّت ہائے بے پایاں اُبھرتی ہیں سنورتی ہیں
جوانی اک بہارِ بے خزاں معلوم ہوتی ہے

دلِ انساں ابھی بیگانۂ آئینِ فطرت ہے
کہ موت اُس کو بلائے ناگہاں معلوم ہوتی ہے

بیاں کرتا ہے جب کوئی کہیں رودادِ غم اپنی
مجھے یکسر وہ اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

گُلستانِ وطن میں آئی ہے کیسی بہار اَب کے
عنادل کی نوا بھی فغاں معلوم ہوتی ہے

مرے اشعار پر محرومؔ یوں کہتے ہیں صاحبدل
یہ دِلّی کی نہیں دِل کی زباں معلوم ہوتی ہے

کیا اَور آبرو تجھے اے چشمِ تر ملے
ملتے ہیں کس صدف میں جو تجھ کو گہر ملے

کوئی نہ ساتھ منزلِ مقصود تک گیا
راہِ فنا میں گرچہ بہت ہمسفر ملے

پھینکا ہے مجھ کو وادیِ وہم و گماں میں کیوں
جس میں ترا سُراغ، نہ اپنی خبر ملے

یوں زندگی سے مل کے جوانی جدا ہوئی
جیسے کسی سے کوئی سرِ رہگذر ملے

دیتا ہمارے نالۂ خونیں کی داد کون
سب اپنی حسرتوں کے یہاں نوحہ گر ملے

پیری سے ہے اجل کو تقاضا رحیل کا
دل چاہتا ہے لذتِ خوابِ سحر ملے

محروم لاجواب ہے غالب کی وہ غزل
"تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے"

صورت کوئی قرار کی دن رات میں نہیں
یہ چیز وہ ہے جو مرے اوقات میں نہیں

کہتے ہیں عُذر ہم کو ملاقات میں نہیں
ہم تجھ سے متّفق مگر اک بات میں نہیں

وہ فصل کون سی ہے جو راس آئے گی ہمیں
تسکیں بہار میں نہیں، برسات میں نہیں

عقبےٰ کا کچھ تو اے دلِ ناداں رہے خیال
کیا تجھ کو وہم ہے کہ اجل گھات میں نہیں

ق
آزاد قید و بند سے ہیں آج اہلِ فن
پابندی کوئی کسی بات میں نہیں

جو جس کے جی میں آئے لکھے اور چھاپ دے
کچھ فرق شعر اور خرافات میں نہیں

پرہیزگار بھی اسے ہرگز نہ جانئے
محروم اگرچہ اہلِ خرابات میں نہیں

سرمستِ مے کو دیکھ کے مت سوئے جام دیکھ
ساقی، پلا اُسی کو جسے تشنہ کام دیکھ

عشوے ترے ہیں خوب، مگر اے عروسِ دہر
جو تجھ سے بے نیاز ہیں، اُن کا مقام دیکھ

افزونیٔ جمال کا باعث ہے فاصلہ
فرشِ زمیں سے جلوۂ ماہِ تمام دیکھ

کچھ کہہ رہی ہیں تجھ سے ستاروں کی چشمکیں
چشمِ یقیں سے جلوۂ نیرنگِ شام دیکھ

نظارۂ جہاں سے نہ دے دل کو داغِ رشک
عبرت کی آنکھ سے یہ تماشائے عام دیکھ

گونجا کئے کبھی جو نواہائے عیش سے
کس حال میں ہیں وہ در و دیوار و بام دیکھ

ہمدم، محاسبہ مرے اعمال کا نہ کر
اُس کو خدا پہ چھوڑ کے میرا کلام دیکھ

۳۹

واہ ہے اے پیرِ مغاں بابِ کریمانہ ابھی[1]
کھول آنکھیں، اور کھلا رہنے دے میخانہ ابھی

خام ہے اے دل ترا، ذوقِ طوافِ شمعِ حسن
سیکھ پروانے سے رسم و راہِ پروانہ ابھی

رٹ یہی ہے، "چاند لیں گے، چاند پر جائیں گے ہم"
فطرتِ انساں ہے وقفِ خوئے طفلانہ ابھی

ق
نامرادانِ وفا کے نام نے پایا دوام
ہے لبِ بزمِ جہاں پر اُن کا افسانہ ابھی

کوہساروں سے ابھی آتی ہے تیشے کی صدا!
محفلِ رقصاں بگولوں سے ہے ویرانہ ابھی

[1] مشاعرۂ یومِ مخمور کی غزل

بے ستوں میں ملتے ہیں تمثالِ شیریں کے نشاں
کوہکن کا یعنی ہے روشن عزا خانہ ابھی

انتظارِ محملِ لیلےٰ میں ہے شام و سحر
قیس کا وہ بے در و دیوار کاشانہ ابھی

آمدِ ایامِ گل کا آئے کیا ہم کو یقیں
کہتے ہیں محرومؔ کو سب لوگ فرزانہ ابھی

۸۰

دل جو دنیا میں مبتلا نہ رہے　　خوف اُسے موت کا ذرا نہ رہے

حق نے بخشا ہے دل کا آئینہ　　حیف اِس پر جو حق نما نہ رہے

جلوۂ حسن تھا جنوں انگیز　　ہوش اپنے یہاں بجا نہ رہے

ڈھونڈتے ہیں ترا سہارا ہم　　جب کوئی اور آسرا نہ رہے

راستی ہو شعار اگر محرومؔ
شکوۂ دہرِ کج ادا نہ رہے

قطعہ

ہے یہ دُنیا شکار گاہِ قضا　　اِس میں کوئی نہ رہ سکا، نہ رہے

پُجتے ہیں مندروں میں بُت جن کے　　جن کو مانا گیا خُدا، نہ رہے

تھے جو فضل خدا کے بندوں میں　　اَولیا اور انبیا، نہ رہے

عارفانِ خداپرست گئے — حق پرستانِ باصفا نہ رہے

کر گئے جو خدائی کا دعویٰ — ہو گئے مُورِدِ بلا، نہ رہے

خضر کہتے ہیں زندہ ہے اب بھی — ہم بھی مانیں، اگر چھپا نہ رہے

پست گُردانِ سر بلند ہوئے — شہسوارانِ فتنہ زا نہ رہے

خاک شاہانِ ارجمند ہوئے — خسروانِ جہانِ کُشا نہ رہے

دلِ عَالم کو لُوٹنے والے — دِل رُبایانِ مہ لقا نہ رہے

جاں سپارانِ جلوہ کاریٔ حُسن — رہروانِ رہ وفا نہ رہے

ذاتِ حق کے سوا بقا کس کو

نہ کوئی تا اَبد رہا، نہ رہے!

وہی ارمان جیتے جی، جو مشکل سے نکلتے ہیں
بہ شکلِ آہ و فریاد و فغاں دل سے نکلتے ہیں

کسی میں حوصلہ ہوتا ہے طوفانوں سے لڑنے کا
سفینے یوں تو سب دامانِ ساحل سے نکلتے ہیں

ہمارے ہم سفر ہم سے مکدر ہیں بس اتنے پر
کہ ہم بچ کر غبارِ راہِ منزل سے نکلتے ہیں

غضب ہے اے زمیں، تو اُن حسینوں کو نگل جائے
جو حسنِ ضو فشاں ہیں ماہِ کامل سے نکلتے ہیں

پھر جلوۂ بہار بداماں ہے چاندنی
روئے زمیں پہ یاسمن افشاں ہے چاندنی

بالائے بام تم ہو کہ ماہِ تمام ہے
کیسی یہ زیرِ بام نمایاں ہے چاندنی

شبنم نے آ کے رنگ میں کیا بھنگ ڈال دی
کیا ہو گیا ہے؟ کس لیئے گریاں ہے چاندنی

دَورِ پیری ہے، یہ شباب نہیں صبحِ صادق ہے، وقتِ خواب نہیں
تُو بھی میرا سوال ہے گویا کہ جہاں میں ترا جواب نہیں
شغل سب کو ہے کچھ نہ کچھ درکار
نکتہ چیں ہے جو نکتہ یاب نہیں

ساغرِ صہبائے رنگیں پر لپکتے ہیں حریف
ہم کو ساقی سے نہیں اک گھونٹ پانی کی اُمید
فکرِ تعمیرِ نشیمن کس لیئے اے ہم نوا
جب نہ ہو شاخِ چمن سے گُل فشانی کی اُمید

نہ ہے ذوقِ سیرِ چمن مجھے نہ ہے اب بہار کی آرزو
کہ مٹا دی کثرتِ یاس نے دلِ داغدار کی آرزو

وہ ہیں مستِ بادۂ سرخوشی اُنھیں کیا خبر اُنھیں کیا غرض
کہ تڑپ تڑپ کے فنا ہوئی کسی بے قرار کی آرزو

موت اگر باعثِ تسکیں ہے تو مر دیکھیں گے
یہی جینا ہے تو وہ بات بھی کر دیکھیں گے
ہم جہاں جائیں بیاباں ہو کہ گلشن محروم
اپنی افسردگیٔ دل کا اثر دیکھیں گے

نہ طلب ہے شاہد و شمع کی، نہ غرض ہے بادہ و جام سے
کہ ہجومِ نور و سُرور ہے، ترے ذکر سے ترے نام سے
نہ اُمیدِ امن و اماں کہیں، نہ نویدِ راحتِ زندگی
کہ زمانہ برسرِ جنگ ہے ابھی اپنے کُہنہ نظام سے

جبیں کو اپنی جو تُو واقفِ نیاز کرے
وہ بے نیاز ابھی تجھ کو سرفراز کرے

کیا کبھی تو نے بہ چشمِ غور یہ دیکھا بھی ہے
کس نظر سے دیکھتے ہیں دیکھنے والے تجھے!

لکھا تو ہے خطِ شوق، لیکن جواب ہم لے کے کیا کریں گے
جواب اُن کا عتاب ہوگا، عتاب ہم لے کے کیا کریں گے

ساقی نے اِدھر ہاتھ بڑھایا تھا بہ مشکل
تقدیر نے ساغر کو کہاں توڑ دیا ہے

زندگی کیا ہے؟ غمِ ہجر کا طوفانِ عظیم
موت کیا ہے؟ اسی طوفاں کا فرو ہو جانا

کیوں خیالِ عزمِ ترکِ مدعا کرتا ہوں میں
یہ بھی ہے اک مدعا، حیراں ہوں کیا کرتا ہوں میں

دورِ دوم
۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک

۱

کس طرح آخر پہنچتے تا درِ جانانہ ہم
تھے اسیرِ امتیازِ کعبہ و بت خانہ ہم

اپنی خلوت گاہ میں تو محوِ آرائش رہا
اور تڑپتے رہ گئے اے جلوۂ جانانہ ہم

انتشارِ بزم اے ساقی ترے عشووں سے ہے
ورنہ ہیں لب تشنۂ جرعاتِ یک پیمانہ ہم

آخری منزل میں اک سنگیں حقیقت بن گئی
زندگی جس کو سمجھتے آئے تھے افسانہ ہم

تیری خاطر چھوڑ کر ویرانہ اب جائیں کہاں
تو ہی تھا ویرانہ جُو یا اے دلِ دیوانہ ہم؟

اپنے دل میں ضبط ہے دل کی خلش سینے کا سوز
گرچہ ظاہر میں نہ بُلبل ہیں نہ ہیں پروانہ ہم

اس کو ویرانی کے خدشے سے اماں ممکن نہیں
جب تلک ہیں باعثِ آبادیٔ کاشانہ ہم

نے غمِ دورِ خزاں نے اشتیاقِ فصلِ گُل
اِس چمن میں ہیں مثالِ سبزۂ بیگانہ ہم

اپنے حسبِ حال ہے محرومؔ، غالبؔ کا یہ قول
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمّتِ مردانہ ہم!

۲

تم ہو صحنِ باغ میں جب زینت افزائے بہار
کیوں بہارِ لالہ و گُل پر نہ آ جائے بہار

داغہائے دل نے دکھلایا جو گلشن کا سماں
ہم یہ سمجھے آ گئی فصلِ طرب زائے بہار

آہ! گُل بوٹے تمنّاؤں کے سب برباد ہیں
باغ میں اب آئے یا واپس چلی جائے بہار

مر گیا اک نو بہارِ ناز کی فرقت میں دل
ہو گیا بیگانۂ لطفِ تماشائے بہار

پاس ہے تیرے علاجِ خاطرِ افسردہ بھی؟
اے نسیمِ موسمِ گُل، اے مسیحائے بہار

ہائے وہ تیری فضائیں، نغمہ زارِ ذوقِ دل

یاد پھر ہم کو دلاتی ہیں نوا ہائے بہار

ہو مبارک تجھ کو یہ دَورِ طرب اے عندلیب

ہم بھی تھے تیری طرح سرمستِ صہبائے بہار

آشنائے فصلِ گُل تھا دل ہمارا بھی کبھی

تھی نگاہِ شوق اپنی بھی شناسائے بہار

فصلِ گُل میں کچھ نہ کچھ محروم کہہ لیتے ہیں ہم

ہر برس در پردہ ہوتا ہے تقاضائے بہار

۳

ہوتے ہیں خوش کسی کی سِتمرانیوں سے ہم

وقفِ بلا ہیں اپنی ہی نادانیوں سے ہم

کس منہ سے جا کے شکوۂ جور و جفا کریں

مرتے ہیں اور اُن کی پشیمانیوں سے ہم

میراث دشت و کوہ ہیں فرہاد و قیس کی

الفت کو پوچھتے ہیں بیابانیوں سے ہم

گھر بیٹھے سیر ہوتی ہے ارض و سما کی روز

محوِ سفر ہیں طبع کی جولانیوں سے ہم

کیوں کر بغیرِ جلوۂ حیرت طرازِ حسن

پائیں نجات دل کی پریشانیوں سے ہم

اے بانیٔ جفا ترا احساں ہے اس میں کیا

جیتے ہیں گر تو اپنی گراں جانیوں سے ہم

ہمّت ہو سخت کوش تو سب مشکلیں ہیں سہل
رہتے ہیں مشکلوں میں تن آسانیوں سے ہم

لبّیک کہہ سکے نہ صلائے جنوں پہ حیف
شرمندہ اپنے دل میں ہیں نادانیوں سے ہم

ہے سحرِ حُسن خالقِ نغمہ، یہ پا گئے
اے عندلیب! تیری نواخوانیوں سے ہم

آزردہ شور و شر سے تمھارے ہے جانِ ہند
یہ جی میں ہے کہ جا کہیں ملتانیوں[1] سے ہم

کانٹوں میں رہ کے پھول یہ تو نے کھلائے ہیں
محروم خوش ہیں تیری گُل افشانیوں سے ہم

[1] سنہ ۱۹۲۸ء میں ملتان میں ہندو مسلم فسادات برپا ہوئے اِس شعر میں انھیں فسادات کی طرف اشارہ ہے

کیوں مائلِ تپش نہ رہے زندگی میں دل
پاتا ہے جب کہ زندگی اپنی اسی میں دل

ہم غمزدہ کہاں تھے، کہاں تیری بزمِ ناز
پہنچا کہاں سے آج کہاں بیخودی میں دل

ظاہر میں تھا یہ عشق جوانی کی دل لگی
آخر ہوا تباہ اسی دل لگی میں دل

اپنا زیاں کرے تو شکایت کسی کو کیا
لے ڈوبتا ہے جاں کو مگر عاشقی میں دل

پھر جی سکو گی کیا نہ تم اے مُردہ حسرتو!
کرتا ہے تم کو یاد بہت بے کسی میں دل

فطرت نے داغدار رکھا اندرونِ گُل
بھولے نہ داغِ غم کو بہارِ خوشی میں دل

پایا ہزار شکر نہ دنیا کو حسبِ کام
محروم ورنہ ہم بھی لگاتے اسی میں دل

۵

تقدیر اگر ہے ناموافق — موہوم ہے جذبِ عشقِ صادق

ہو جاتے ہیں دورِ عاشقی میں — حالات تمام ناموافق

اُٹھتا ہے نقابِ رُخ کسی کا — ہوتا ہے ظہورِ صبحِ صادق

ملتا رہے آب و دانۂ اشک — آتا رہے لب پہ شکرِ رازق

ہر چند نہیں وہ دورِ وحشت — ق — تھا عقل پہ عشق جبکہ فائق

دل کو پاتا ہوں مائلِ حُسن — اب بھی مثلِ زمانِ سابق

حسرت نے کہا ہے خوب یہ شعر — ق — بالکل مرے حال کے مطابق

مقطع یہ رہے مری غزل کا — دیں دادِ سخن، سخن کے شائق

محروم نہیں تو اور کیا ہے؟

اُس دشمنِ عاشقاں کا عاشق

۶

رُکتا ہے کیوں سحابِ کرم، اور بھی برس
شانِ کرم کی تجھ کو قسم، اور بھی برس

دامانِ دشت دامنِ سائل سے کم نہیں
سائل کے حال پر ہو کرم، اور بھی برس

زیبا یہ رُک رُکاؤ نہیں اہلِ فیض کو
ہاں پھر برس، برس کے نہ تھم، اور بھی برس

چہرے ذرا تو دیکھ عروسانِ باغ کے
دھوئے گا تُو ہی گردِ الم، اور بھی برس

بُوٹے اُگا کہیں، گُلِ خنداں کِھلا کہیں
صحنِ چمن ہو رشکِ ارم، اور بھی برس

برسے ہوئے برس سے سوا ہو گیا تجھے
تجھ کو ترس ترس گئے ہم، اور بھی برس

تپ تپ کے یہ زمیں کرۂ نار ہو گئی
ذرے نہیں شراروں سے کم، اور بھی برس

جھونکے تری ہوا کے ہیں رشکِ دمِ مسیح
آیا ہے لب پہ قحط سے دم، اور بھی برس

مُدّت کے بعد مائلِ ذوقِ سخن ہوا!
محروم کچھ تو کر لے رقم اور بھی برس

چمک اے گوہرِ ہستی چمک مہر آشنا ہو کر
رہے گا کب تلک آلودۂ گردِ فنا ہو کر

نکل وہمِ فنا سے واقفِ رازِ بقا ہو کر
تو میدانِ عمل میں آ حقیقت آشنا ہو کر

تو آزادِ ازل ہے توڑ دے غفلت کی زنجیریں
رہے گا تا بہ کے ناداں گرفتارِ بلا ہو کر

خیالی دام ہے غافل! یہ دامِ عالمِ سفلی
پر افشاں ہو فضائے قدس میں اس سے رہا ہو کر

در و دیوار پر تو افگنِ نورِ حقیقت ہیں
گزر دارِ فنا سے رہروِ صدق و صفا ہو کر

زمانہ خاکساری کا نہیں خود دار بن کر اُٹھ
مٹا وہ راہِ منزل میں جو بیٹھا نقشِ پا ہو کر

ریا کی زندگی سے ہاتھ کیا آیا بجز حسرت
کوئی دن آزمالے زندگی کو بے ریا ہو کر

باغباں پہ زور چلتا ہے نہ کچھ صیاد پر
سختیاں کرتا ہوں میں اپنے دلِ ناشاد پر
اُن کا رو دینا مزارِ کشتۂ بیداد پر
ابرِ نیساں کی ہے بارش گلشنِ برباد پر
وہ بھی ہیں افسردہ مرگِ عاشقِ ناشاد پر
کہنے والا کون ہے اب "مرحبا" بیداد پر
کس گرفتارِ قفس کی آہِ آتشبار سے
"بجلیاں گرنے لگی ہیں خانۂ صیاد پر"
اُن سے کیا ذکرِ تلاطم خیزئ دریائے عشق
جو تُلے بیٹھے ہوں ناصح "ہرچہ باداباد" پر
یا خیالِ ابروئے خُوباں سے دل کو باز رکھ
یا رگِ گردن کو رکھ دے خنجرِ فولاد پر
عشقِ صادق کو گوارا کیوں ہُوا کیوں کر ہُوا
حیلۂ پرویز غالب تیشۂ فرہاد پر

بعد مُردن رُوح تیرے خانماں برباد کی
ہو گی آوارہ فضائے نکہتِ برباد پر

حلقۂ دامِ علائق، بندِ مذہب، قیدِ ننگ
کس قدر پابندیاں ہیں فطرتِ آزاد پر

اس قدر بڑھتے گئے قصّے کہ دفتر ہو گئے
حاشئے چڑھتے گئے اے دل تری رُوداد پر

نالہ کش ہو گر ترا غمدیدۂ ہجراں نصیب
فتنۂ شورِ قیامت چونک اُٹھے فریاد پر

اِس میں اے معمارِ ہستی! مصلحت تھی کونسی
ایسا قصرِ خوشنما اور ریت کی بنیاد پر

یاد جس کی دل کا میرے حال کر دیتی ہے غیر
دل مجھے مجبور کرتا ہے اُسی کی یاد پر

دفن ہے ہندوستاں کی اس میں تہذیبِ قدیم
پھُول برسا اے صبا خاکِ جہاں آبادؔ پر

دل ہے بے ذوقِ غزل محروم لیکن چند شعر
لکھ دیئے ہیں حضرتِ ارمانؔ کے ارشاد پر

لہ دہلی سے مراد ہے۔ سہ پنڈت رام نرائن ارمان دہلوی

حُسن گرداب فنا ہے، پھر یہ طوفانِ سحر
صبح کے تارے! سنبھل کر تھام دامانِ سحر

یُوں پشیماں ہُوں مَیں غفلت میں جوانی کاٹ کر
جس طرح دن بھر پشیماں ہو پشیمانِ سحر

خُونِ انجم پردۂ شب میں نہ پنہاں رہ سکا
لالہ گوں دیکھا زمانے بھر نے دامانِ سحر

یاس سے اُمّید ہو جاتی ہے اکثر رُونما
رات کے پردے میں ہو جاتا ہے سامانِ سحر

حُسن یہ سارا اُسی کا ہے کہ جس کے عشق میں
چاک روزِ ابتدا سے ہے گریبانِ سحر

سُوئے در کیا دیکھتا ہے اے دلِ غمدیدہ! دیکھ
یہ شبِ فرقت ہے، اس میں کم ہے امکانِ سحر

میں بھی جانوں، تم نے کیا دیکھا ہے، جس کو دیکھ کر
ہے یہ طوفانِ نوا، اے نغمہ سنجانِ سحر

کچھ کم نہیں ندامتِ پنہاں خطا کے بعد
بے سُود ہے ہر ایک سزا اِس سزا کے بعد

فکرِ معاشِ اہلِ محبّت نہ کیجیے
کھانے کو خونِ دل ہے فریبِ وفا کے بعد

اِس دَور میں کرم کا روادار کون ہے
پچھتائے کیوں کوئی ستمِ ناروا کے بعد

شاہوں کے ساتھ یہ بھی ہے تقدیر کا مذاق
رزقِ ہما ہوں سایۂ بالِ ہُما کے بعد

اِس کا علاج کیا ہے بہ جز ترکِ مُدّعا
جب سامنا ہو یاس کا ہر مُدّعا کے بعد

تاریخ اس کو بھول سکے گی نہ اے وطن!
آئے گا ذکرِ کربِ ترا کربلا کے بعد

بے مہریٔ بُتاں سے خدا یاد آگیا
محرومؔ کس کو یاد کروگے خدا کے بعد

۱۱

گُزرا دوا کا مرحلہ، وقتِ دُعا ہے اب

مایوسِ زندگی دلِ دَرد آشنا ہے اب

دُنیا کو خوب دیکھ لیا، ہیچ، ہیچ، ہیچ

پیشِ نگاہ اے دلِ غمدیدہ کیا ہے اب

اب آرزو یہ ہے کہ نہ ہو آرزو کوئی

باقی نہ مدّعا ہو، یہی مُدّعا ہے اب

سرمنزلِ بقا کا نشاں موت نے دیا

رہزن جسے سمجھتے تھے وہ رہنما ہے اب

اہلِ جہاں کو نالۂ غم سے رلاؤں کیا

مجبورِ خامُشی مرا ذوقِ نوا ہے آج

۱۳

ہر نظارے میں ہیں سو پرتوِ جاناں پیدا
کیوں نہ ہو دیکھنے والے میں نئی جاں پیدا

طربِ دل سے بیاباں بھی ہے رشکِ گلشن
دل ہو ناخوش تو ہو گلشن میں بیاباں پیدا

جن کی تقدیس کی کھاتے ہیں فرشتے بھی قسم
ہم گنہ گاروں میں ہوتے ہیں وہ انساں پیدا

کر ہی ڈالے گی ہوائے چمنِ دھر ملول
صورتِ گل بھی اگر کوئی ہو خنداں پیدا

ظلمتِ یاس میں امّید کی پنہاں تھی جھلک
پردۂ شب سے ہوا نیّرِ تاباں پیدا

غیب سے ہمتِ مردانہ کو ملتی ہے مدد

عزمِ راسخ ہو تو ہو جاتے ہیں ساماں پیدا

مایۂ نازشِ دوراں یہ پریشانی ہے

روز ہوتے ہیں کہاں ہم سے پریشاں پیدا

حق نے شاعر کے تخیل کو وہ قدرت بخشی

ذرۂ خاک سے کر دے چمنستاں پیدا

۱۳

عشق کی دُنیا میں جنسِ غم کو ارزاں کر دیا
ہم غریبوں کے لیئے جینے کا ساماں کر دیا

زیست کی دشواریوں نے یہ تو احساں کر دیا
موت سی مشکل کو میرے حق میں آساں کر دیا

حُسن کو جاں بخشیاں دیں تو نے اے حُسن آفریں
آہ! لیکن پھر اُسی کو دشمنِ جاں کر دیا

میں تو جب مانوں کہ میرے دل کی بیتابی مِٹے
کیا ہوا اگر آئینے کو تم نے حیراں کر دیا

کر دیا ظاہر وہ کچھ جس سے پریشاں ہو نظر
جس سے تسکیں دل کو ہو وہ رازِ پنہاں کر دیا

کیا نہ کردے تیرے دل کو وہ اگر کرنے پہ آئے
خاک کے ذرّوں کو جس نے مہرِ تاباں کر دیا

شوق سے جا کر علاجِ کُشتگانِ شوق کر
دل کو ہم نے بے نیازِ درد و درماں کر دیا

ہے یہ دُنیا ایک ہی افسانۂ ناکامِ شوق
جس نے جو چاہا الگ تجویز عنواں کر دیا

طبعِ رنگیں نغمہ زارِ شوق تھی اپنی، مگر
حادثاتِ دہر نے اس کو بیاباں کر دیا

۱۴

نقش اُن کے دل پہ اپنا بٹھایا نہ جائے گا
پتھر کو یعنی موم بنایا نہ جائے گا!
اچھا ہوا نتیجہ ہمارے مآل کا
کہتے ہیں اب کسی کو ستایا نہ جائے گا
کیا ذکر ہے یہ زہر کی تلخی کا بار بار!
فرقت کا غم نہیں ہے کہ کھایا نہ جائے گا
مائل بہ التفات انھیں کر بھی لیا تو کیا
حالِ غمِ فراق سُنایا نہ جائے گا
دارِ فنا میں زندہ رہے جن کے بعد ہم
مُنہ اُن کو روزِ حشر دکھایا نہ جائے گا
رونے سے کیا ملے گا کہ سیلابِ گریہ سے
تقدیر کے لکھے کو مٹایا نہ جائے گا

۱۵

اب کیا کروں میں پروردگارا
دُنیا تو نکلی جھوٹا سہارا

یہ بھی گنوائی، وہ بھی گنوائی
عقبیٰ کو ہم نے دُنیا پہ وارا

اُلٹی ہے کیسی اُلفت کی بازی
ہارا سو جیتا، جیتا سو ہارا

دل ٹوٹنے سے ہم یوں ہیں جیسے
خاکِ پریشاں ٹوٹا ستارا

یکساں ہے میرا ہونا نہ ہونا
تُو جلوہ فرما، تُو جلوہ آرا

کرتا ہے انساں مجبور ہو کر
تلخابِ غم کی تلخی گوارا

دل کو سنبھالو، اے نوجوانو!
جب سامنے ہو رنگیں نظارا

پیری میں ورنہ پچھتاؤ گے تم
پورا نہ ہوگا دل کا خسارا

مخمور دم، مجھ کو حیرت یہی ہے
پنہاں حسیں ہے، حُسن آشکارا

۱۶

باعثِ انبساط ہو آمدِ نو بہار کیا
رنگِ چمن دکھائے گا سینۂ داغدار کیا

مستِ طرب ہے چھیڑ کر نغمۂ نو بہار کیا
اب سے نہ ہو گی دل شکن خوئے گُل اے ہزار کیا

عہد پہ اعتماد کیوں؟ وعدے کا اعتبار کیا
رکھیے اُمّید کس لئے؟ کیجیے انتظار کیا

گنبدِ گردِ باد ہے سر بفلک ہر اک طرف
دشتِ جنوں میں رہ گئی قیس کی یادگار کیا

تلخ ہے زیست، کیجیے کس لئے تلخ تر اسے
خُرّمیِ گزشتہ کو روئیے بار بار کیا

شامِ وصال سے ہوں کیا محوِ فریبِ آرزو

یاد نہیں رہی ہمیں صبحِ وداعِ یار کیا

آپ ہی مٹ مٹا کے ہم خاکِ رہِ فنا ہوئے

اور مٹائے گا ہمیں چرخِ ستم شعار کیا

طبعِ سخنوریِ تِلک[لہ]، کانِ گہر سے کم نہیں

سامنے شعرِ تر کے ہے گوہرِ آبدار کیا

لہ مصنف کے نام کی تخفیف

۱۷

کیا سنائیں کسی کو حال اپنا　　اپنے دل میں رہے ملال اپنا

شرمسارِ جواب ہو نہ سکا　　بسکہ خود دار تھا سوال اپنا

کس نے دیکھا نہیں ہے بعد عروج　　سایۂ چرخ میں زوال اپنا

حسرتِ دید لے چلے ہم تو　　آپ دیکھا کریں جمال اپنا

پیچ در پیچ گیسوئے مُشکیں　　جا کے اُلجھا کہاں خیال اپنا

دل اسیرِ بلائے زُلفِ دراز　　محوِ فریاد بال بال اپنا

موت آئی نہ التجاؤں سے　　اور جینا ہوا وبال اپنا

ہے یہ پُر درد داستاں محرمؔ
کیا سنائیں کسی کو حال اپنا

۱۸

وہ آئی شامِ غم، وقفِ بلا ہونے کا وقت آیا
تڑپنے، لوٹنے کا، دم فنا ہونے کا وقت آیا

اُنھیں اپنی جفاؤں پر پشیمانی ہوئی آخر
شریکِ ماتمِ اہلِ وفا ہونے کا وقت آیا

اُداسی ہر سحر کہتی ہے مجھ سے بزمِ انجم کی
اُٹھ اے غمدیدہ! اُٹھ۔ محوِ بکا ہونے کا وقت آیا

ترا ملنا کسے ملتا ہے، ممنونِ مقدر ہوں!
مگر افسوس ملتے ہی جُدا ہونے کا وقت آیا

بہار آئی، ہر اک ذرّے سے پھوٹی حُسن کی دُنیا
فریبِ ماسوا کے حق نما ہونے کا وقت آیا

قیامت خیز ہے حُسنِ چمن اے بلبلِ نالاں
ترے نالوں سے پھر محشر بپا ہونے کا وقت آیا
مری ٹوٹی ہوئی کشتی، تھپیڑے موجِ طوفاں کے
خُدائے پاک تیرے ناخُدا ہونے کا وقت آیا
جوانی جا چکی محرومؔ! ذوقِ آرزو کیسا
تمھارے بے نیازِ مُدّعا ہونے کا وقت آیا

۱۹

دل جلوہ گاہِ عالم میں اُس کو ڈھونڈتا ہے
جلوے عیاں ہیں جس کے، جلووں میں جو چھپا ہے

خاموش گُل ہے، بلبل اک محشرِ نوا ہے
اے عشق خودنما تو، یا حُسن خودنما ہے؟

اک اضطرابِ پیہم پہلے تھا، اب سکوں ہے
وہ غم کی ابتدا تھی یہ غم کی انتہا ہے

حیرت سے دیکھتا ہوں بزمِ جہاں کو جس میں
مخلوط نالۂ غم نغموں سے ہو رہا ہے

دُنیا سے سرگرانی اور کاوشِ نہانی
محروم شاعری میں حاصل یہی مزا ہے

شاید وہ آج کل ہیں آزاد کرنے والے
چپ چاپ ہیں قفس میں فریاد کرنے والے

پہلے وفا کے وعدے، دل لے چکے، جفائیں
کرتے ہیں یونہی اکثر بیداد کرنے والے

بادِ صبا ہمارا پیغام یہ نہ ہو گا
ہم بے کسوں کو کب ہیں وہ یاد کرنے والے

غم میں عجب مزا ہے، دل سے مری دعا ہے
دل شاد ہوں الٰہی ناشاد کرنے والے

دل توڑنے میں اُن کو بیباکیاں ہیں کتنی
بُت ہیں خدا کے گھر کو برباد کرنے والے

دنیا سے دُور رستہ اک عشق کا نکالا
چُوکے ذرا نہ ہرگز ایجاد کرنے والے

سادہ سی اک غزل یہ محروم نے کہی ہے
رنگیں سخن سب اس پر ہیں صاد کرنے والے

۲۱

رونے دھونے میں کٹی افسوس ساری زندگی
ہو گئی گویا شبِ فُرقت ہماری زندگی

مجھ سے مل کر کیا ملا آخر تجھے جُز دردِ غم
کس لئے کی تو نے میری غمگساری، زندگی

یہ نہ ہو تو سنگِ تربت بھی سبک سینے پہ ہو
ہے ہر اک بارِ گراں سے مجھ پہ بھاری زندگی

ہم نشیں مجھ کو بتا کہتے ہیں کس کو زندگی
نالہ و شیون ہے یا ہے آہ و زاری زندگی

مثلِ گُل شگفتہ ہو گو ہو نہایت بے ثبات
کاش ہو جائے مری فصلِ بہاری، زندگی

پھر کہاں ہم اور کہاں تیغِ جفائے دلبراں
ہے ترے ہی دم سے اپنی دلفگاری زندگی

خفتہ و مُردہ برابر یہ مثل مشہور ہے

موت ہے غفلت عزیزو ہوشیاری زندگی

جامِ زہراب محبّت گرچہ شیریں ہے بہت

تلخ کر دیتا ہے لیکن آہ ساری زندگی

جی نہیں کرتا کہ دوں شمعِ محبّت کو فروغ

شب دو شب کی میہماں ہے یہ ہماری زندگی

نوجوانی میں ہوئے لذّت کشِ آزارِ غم

تم نے اب محروم خوش ہو کر گذاری زندگی

۴۳

نہ وہ محفل، نہ وہ ساقی، نہ وہ جام وسبو باقی
یہ عالم ہو تو پینے کی ہو کس کو آرزو باقی

ڈبو دے ساغرِ صہبا میں رنج و غم کو اے ساقی
وہی اوّل، وہی آخر، نہ ہم باقی نہ تو باقی

ہوئے راہِ طلب میں چُور تھک کر وائے ناکامی
نہ تابِ گام فرسائی، نہ ذوقِ جستجو باقی

کہاں گنجائشِ اصلاحِ حال اے ناصحِ ناداں
نہیں اِن دھجیوں میں نام کو جائے رفو باقی

کریں محروم کیا فکرِ سخن سنجی کہ ہے کس کو
حضورِ نغمہ آرایاں مجالِ گفتگو باقی

سُرورِ عاشق بعدِ فنا بھی مونسِ جاں ہے
کہ صحرا کے بگولوں میں غبارِ قیس رقصاں ہے

یہ حیرت خانۂ دُنیا طلسمِ حُسنِ پنہاں ہے
وہی کچھ مطمئن اس میں نظر آیا جو حیراں ہے

خیالِ رنج و راحت میں عبث اے دل پریشاں ہے
نہ یہ قائم نہ وہ دائم یہ پرّاں وہ شتاباں ہے

چراغِ زندگی روشن سرِ راہِ بیاباں ہے
ہوائے دہر کا ہر ایک جھونکا دشمنِ جاں ہے

وہ دانا ہے جسے دنیا میں ہے اقرارِ نادانی
جسے دانائی کا دعویٰ ہے نادانوں کا ناداں ہے

چمن اندر چمن حُسنِ جہاں افروز ہے تیرا
مری منزل مرے آگے بیاباں در بیاباں ہے

مری اُفتادگی پر رحم کر اے حُسنِ بے پروا
عُروج آموز ذرّے کو شعلۂ مہر تاباں ہے

۲۴

مجھ سے ہے گر داستانِ رنج و غم ہے زندگی

ورنہ تیرا لطف ہے تیرا کرم ہے زندگی

ہر سحر پیغام دیتے ہیں یہ مُرغانِ سحر

نالۂ بے اختیارِ صبحدم ہے زندگی

تُو نہ ہو تو اے غمِ جاناں یہ ہے بے کار چیز

تیرے ہوتے مُغتنم ہے مُغتنم ہے زندگی

آہنِ تاریک ہے بے پَرتوِ انوارِ عشق

عشق کے پرتو سے رشکِ جامِ جم ہے زندگی

زندگی وابستہ ہے میری ترے الطاف سے

مجھ کو پیاری اس لئے تیری قسم ہے زندگی

۲۵

ہم جو آہ و فغاں نہیں کرتے	آپ کا امتحاں نہیں کرتے

جانِ و دل دے کے عاشقانِ غیور	نازبرداریاں نہیں کرتے

روز نامہربانیاں ہم پر!	یوں تو اے مہرباں نہیں کرتے

جنسِ نایاب ہے دلِ بیتاب	پھر بھی اس کو گراں نہیں کرتے

عقل کو کیوں بتائیں عشق کا راز	غیر کو رازداں نہیں کرتے

زندگانی ہے آن پر مرنا	مرد پروائے جاں نہیں کرتے

یادِ ایامِ شوق سے محروم
دل کو اب ہم تپاں نہیں کرتے

دل ہو تو دل میں تیری تمنّا کرے کوئی
بیدل ہری طرح ہو تو پھر کیا کرے کوئی

ممکن ہے پھر ہو شعلۂ حسنِ ازل عیاں
مثلِ کلیم مشقِ تقاضا کرے کوئی

جلوے یہ کہہ رہے ہیں تری بزمِ شام کے
تا صبح ماتمِ دلِ دانا کرے کوئی

اِن بے نیازیوں پہ تو دل ہے رہینِ شوق
کیا جانے اِس کو کیا ہو جو پروا کرے کوئی

ہو گی مآلِ کار پریشانئِ نظر
پیدا نہ دل میں ذوقِ تماشا کرے کوئی

کل کی نہ ہو اُمید تو پھر کس اُمید پہ
آباد آرزوؤں کی دُنیا کرے کوئی

محروم محوِ شعر ہے، اس سے غرض نہیں؛
قدرِ سخنوری نہ کرے یا کرے کوئی

۲۷

مستی انگیز ہے ازبسکہ ہوا ساون کی
جھومتی جھامتی آتی ہے گھٹا ساون کی

دشت و گلزار و چمن پر ہے نرالا جوبن
فصل رنگیں ہوئی پھر جلوہ نما ساون کی

نشۂ حسن سوا، ولولۂ عشق فزوں
حسن اور عشق کو ہے راس ہوا ساون کی

ہے ابھی دھوپ، ابھی ابر، ترشح ہے ابھی
مہوشوں سی ہے تلوّن میں ادا ساون کی

شبنم آلودہ وہ راتیں، وہ نسیم سحری
کوک کوئل کی وہ دلدوز نوا ساون کی

دلِ تفسیدۂ فرقت کی تپش اور بڑھی!
آگ برساتی ہے محروم ہوا ساون کی

۲۸

جنھیں حسنِ تدبیر کا آسرا ہے، رُکے گا نہ کام اُن کا کوئی رُکا ہے
درِ کامیابی سدا اُن پہ وا ہے، کہ اربابِ ہمّت کا حامی خدا ہے
جو سرگرمِ محنت کوئی آدمی ہو، ارادوں میں جس کے نہ کچھ برہمی ہو
نہ کچھ عزم کی پختگی میں کمی ہو، ہمالا بھی گر سامنے ہے تو کیا ہے
جُوئے شیر فرہاد لایا کہ شیریں ملے گو نہ باقی رہے جانِ شیریں
فقط ذوقِ پنہاں نے آسان کر دیں، وہ سب مشکلیں جن پہ تیشہ چلا ہے
جو ہیں دوسروں کے سہارے پہ جیتے، وہ تلخابِ حسرت کے ہیں گھونٹ پیتے
کہاں بادۂ کامرانی کہاں وہ کہ انگورِ محنت سے وہ تو کھنچا ہے
فلک ساں طبیعت میں ہو گر بلندی تو چمکا کریں اخترِ ارجمندی
یہی زیرکی ہے یہی ہوشمندی، یہی مرضیِٔ ذاتِ ربّ العلیٰ ہے

ق

جو پستی سے نکلیں خیالات اپنے، بدل جائیں دو دن میں حالات اپنے

نہ منحوس ہرگز ہوں دن رات اپنے، سعادت کا سیدھا ہی رستہ ہے

بخارات نے جبکہ لی راہِ رفعت، فلک پر وہ جا کر بنے ابرِ رحمت

بیاباں ہوئے اُن سے گلزارِ جنّت، گُہر سے سمندر کا دامن بھرا ہے

سخن سنجِ تازہ ہیں محروم ہم بھی، مچا سکتے ہیں شعر میں دُھوم ہم بھی

مگر آہ رہتے ہیں مغموم ہم بھی، کہ بگڑی ہوئی اِس چمن کی ہوا ہے

۲۹

نظر آتا ہے اے مجبوریٔ ضبطِ فغاں مجھ کو

کہ آخر پھونک دے گا شعلۂ سوزِ نہاں مجھ کو

گلستانِ جہاں میں وہ اسیرِ کنجِ حرماں ہوں

قفس سے ہمنواؤ کم نہیں ہے آشیاں مجھ کو

نگاہِ انتخابِ دوست پر نازاں ہوں محفل میں

کیا ہے منتخب جس نے برائے امتحاں مجھ کو

ملانا تھا مقدّر کو مجھے خاکِ مذلّت میں

تلاشِ حُسن لے آئی سرِ کوئے بُتاں مجھ کو

تمنّا ہے کہ مجھ سے یہ نہ چھوٹے بعد مُردن بھی

وطن کی سرزمیں ہے انتخابِ دو جہاں مجھ کو

نہ تھی یہ منزلِ مقصود لیکن کر دیا آخر

فریبِ آرزو نے محوِ نیرنگِ جہاں مجھ کو

شریکِ درد و غم کوئی، نہ پُرسانِ الم کوئی

شکایت ہے مقدّر سے کہ لے آیا کہاں مجھ کو

کچھ ایسی جاں فزائی اس میں پاتا ہوں کہ ممکن ہے

تصوّر بخش دے تیرا حیاتِ جاوداں مجھ کو

جہاں کے شادی و غم میں اُلجھ کر رہ گیا آخر

دلِ محروم پر ہرگز نہ تھا ایسا گُماں مجھ کو

پہلو میں دل کے موت کا دھڑکا لگا دیا
دی مجھ کو زندگی کہ پیامِ فنا دیا
محرومیِ نصیب کا شکوہ مٹا دیا
سب کچھ دیا جو اک دلِ بے مدّعا دیا
دردِ نہاں دیا، دلِ درد آشنا دیا
کیا اس کے بعد، کیا نہ دیا اور کیا دیا
اچھی نہیں ہے یاد کسی بد نصیب کی
اچھا کیا جو آپ نے مجھ کو بھُلا دیا
وہ داغ بن کے دل پہ مرے ثبت ہو گیا
جو نقش تو نے چرخِ ستمگر مٹا دیا
دل چاک ہے کوئی، کوئی نالاں ہے اے نسیم
کیا تو نے ساکنانِ چمن کو سُنا دیا

دل میں بُتوں کا اُنس بھی، یادِ خدا بھی ہے
یوں ہم نے دیر و کعبہ کو باھم ملا دیا

انجامِ کارِ ذوقِ تماشا ہوا جُنوں
اور اس جنوں نے ہم کو تماشا بنا دیا

حیراں ہوں اپنے گریۂ غم پر کہ کس طرح
پانی کی چار بُوندوں کو طوفاں بنا دیا

پُرساں ہوا نہ کوئی تری بزمِ ناز میں
پہلو میں اُٹھ کے درد نے مجھ کو بٹھا دیا

محرومؔ ڈگمگائی بہت زورقِ حیات
انفاسِ واپسیں نے کنارے لگا دیا

نہ فضائے باغ ہے دیدنی، نہ گلِ بہار ہے چیدنی
کہ طلسمِ رنگ شکستنی ہے شمیمِ گل ہے پریدنی

نہیں جائے عیش یہ بزمِ غم نہ پتا ہے خاکِ ہزار جم
نہ بساطِ شوق ہے چیدنی نہ مئے نشاط چشیدنی

دمِ مستعار ہے زندگی تجھے اس کے سُود و زیاں سے کیا
غمِ روزگار سے ہاتھ اُٹھا کہ نہیں یہ جنس خریدنی

بہ ہوائے شاہدِ لالہ گوں ہُوا کس طرح دلِ زار خوں
کئی بار اگرچہ سُنا چکے، ہے یہ قصہ پھر بھی شنیدنی

نہ قیام فطرتِ حُسن میں، نہ قرار قدرتِ عشق میں
دلِ بے قرار تپیدنی، بُتِ عشوہ کار رمیدنی

تبرِ فنا ہے تُلا ہوا، سرِ برگ و شاخ و ثمر سدا
وہ تعلقات فریب ہیں جو سرشت میں ہیں بُریدنی

وہی آسماں ہے وہی زمیں مگر آہ اے تلکِ[1] حزیں
وہ نگاہیں تیری کدھر گئیں، یہ بلند و پست ہے دیدنی

[1] شاعر کے نام کی تخفیف ہے

جو سوادِ شامِ فنا ہیں تُو بہ خیالِ صبحِ بقا رہے
اثرِ بہارِ دوام سے ترے دل کا پھُول کھِلا رہے
"تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ، درِ دل کشا بچمن درآ"
چمنِ جہاں نہیں ایک سا تو بدلتی اس کی ہَوا رہے
جو حریمِ نازِ قدیم کو تُو بنائے مقصدِ جستجو
نہ قتیلِ تیغِ نگاہ ہو، نہ اسیرِ زُلفِ دو تا رہے
مہ و حور کو جس سے چمک ملی، گُلِ تر کو جس سے مہک ملی
تری چشمِ شوق کے سامنے وہی حُسن جلوہ نما رہے
یہ فضائے حیرتِ حُسن اگر دلِ بے قرار کا ہو گُزر
نہ جنونِ عقلِ رسا رہے، نہ فسونِ حرص و ہوا رہے
نہیں کم ہُما سے یہ دل ترا، سرِ خاکِ راہ ہے کیوں پڑا
اسے ذوق و شوق کے پَر لگا کہ تُو زیرِ بالِ ہما رہے
یہ جو شب ہے ماہ اسی میں ہے، جو ہے دشت راہ اسی میں ہے
یہ ترا قصور ہے[1] تِلک کہ تو زندگی سے خفا رہے

[1] مصنف کے نام کی تخفیف ہے

اَوجِ مقامِ دوست پہ اپنا گزر کہاں
شایانِ سدرہ طائرِ بے بال و پر کہاں
تو ہے خیال میں تو ہے آرائشِ خیال
تُو ہی نہ ہو نظر میں تو ذوقِ نظر کہاں
دیکھو جسے وہ مستِ مئے کبر و ناز ہے
دنیا بہت خراب ہے، جائیں مگر کہاں
ہے ابتدائے شام سے ظلمات کا سفر
ہوتی ہے دیکھئے شبِ غم کی سحر کہاں
تقدیر میں ہے اُس کی فشارِ لحد وہی
تدبیر سے اُڑا بھی تو پہنچا بشر کہاں
اِس بے خودی میں کس کو ہے پروا مآل کی
موجود مبتدا ہی نہ ہو تو خبر کہاں
محروم کیا ہی خوب ہے حالیؔ کی وہ غزل
"تجھ سے جہاں میں لاکھ سہی تو مگر کہاں"

تزئینِ زلف و تابشِ رُخ پر نظر کہاں
اے عہدِ ذوق و شوق وہ شام و سحر کہاں

تیری نگاہِ ناز شکیب آزما سہی
تیری نگاہِ ناز کے قابل جگر کہاں

برپا ہے شش جہات میں طوفانِ رنگ و بُو
ہے آب و تابِ حسن وہی، ہم مگر کہاں

باقی ہے جوشِ گریۂ خونیں کی یادگار
دھیمی سی آہِ سرد، سو اِس میں اثر کہاں

راتوں کی نیند اُچاٹ ہوئی جن کی یاد میں
وہ دن پلٹ کے آئے ہیں بارِ دگر کہاں

رقصاں ہے موجِ بحرِ فنا زیرِ سقف و بام
اے زندگی، یہ تو نے بنایا ہے گھر کہاں

خاکسترِ شباب ہے پیری ہے جس کا نام
محروم اس میں شعلہ کہاں اور شرر کہاں

غلط کہ ہجر میں حاصل مجھے قرار نہیں
اسیرِ یاس ہوں، پابندِ انتظار نہیں
ہے اُن کے عہدِ وفا سے مناسبت دل کو
اُسے قیام نہیں ہے، اِسے قرار نہیں
یہاں تو ضبطِ جنوں پر نہ کر مجھے مجبور
فضائے دشت ہے اے عقل، بزمِ یار نہیں
قفس میں ڈالے گا کس کس کو آخر اے صیاد
اسیرِ دامِ وفا سو نہیں، ہزار نہیں
جہاں میں بلبلِ باغِ خزاں نصیب ہوں میں
مری نواؤں میں رنگینیٔ بہار نہیں

۳۶

اگرچہ فردِ عمل ہم سیاہ رکھتے ہیں
خدا کے فضل و کرم پر نگاہ رکھتے ہیں

نہیں ہے فرقتِ جاناں میں خوفِ تنہائی
کہ ساتھ قافلۂ اشک و آہ رکھتے ہیں

نہیں کسی کی شکایت سوائے دیدہ و دل
یہی تو ہم کو بحالِ تباہ رکھتے ہیں

کہاں میں ذرّۂ خاکی، کہاں مزاج اُن کا
جو شانِ مہر و ادائے ماہ رکھتے ہیں

بہت نہ بزمِ فنا میں ہو محوِ آرائش
حباب بحر فقط اک کلاہ رکھتے ہیں

۳۷

کس ستارے میں تجلیِ سرِ طور نہیں
جلوۂ حُسنِ ازل آج بھی مستور نہیں

مے سے نفرت نہیں میخانہ بھی کچھ دُور نہیں
ناز برداری ساقی مجھے منظور نہیں

دلبری پیشہ ہے تو روزِ ازل سے اے حُسن
دل نوازی کا ترے مُلک میں دستور نہیں

دُور ہے دیدۂ مشتاق سے جلوہ تیرا
تو جو ہو مائلِ الطاف تو کچھ دُور نہیں

یاس کہتی ہے کہ دے دل تجھ کو سکونِ کامل
دلِ بیتاب کو یہ بات بھی منظور نہیں

کون مختار ہے دُنیائے وفا میں اے دل
جو ہے مجبور ہے اک تُو ہی تو مجبور نہیں

نکتہ چیں ہیں کئی، حاسد ہیں کئی شہرت کے
وہی آرام سے رہتا ہے جو مشہور نہیں

ذوقِ جنّت میں ہے واعظ پہ نشہ سا طاری
وعدۂ حُور کم از بادۂ انگور نہیں

سازِ بشکستہ ہے محروم دل اپنا لیکن!
نالۂ ہجر سُنا چاہو تو معذور نہیں

۳۸

کیا ہے ہوس بغیر جہانِ خراب میں
بندش ہے سب طلسمِ ہوا کی حباب میں

رنگِ بقا ہے عشرتِ فانی میں اِس طرح
پانی کا جیسے جلوہٗ دل کش سَراب میں

دُنیا کو اہمیت مری غفلت سے مل گئی
ورنہ یہ اک خیال ہے اور وہ بھی خواب میں

روشن بھی ہو تو باعثِ نقصاں ضرور ہے
مانندِ برق دل جو رہے اضطراب میں

کیا فیض کم سواد کو اہلِ کمال سے
کم تاب ہیں نجوم شبِ ماہتاب میں

ہر چشمِ اشکبار میں مضمر ہے اک بلا
ثابت ہے جیسے برق کا ہونا سحاب میں

رکھتے ہیں شامِ عمر کا سامانِ روشنی

دو چار داغ ہم نے بھی کھائے شباب میں

وصفِ شکنجِ زلف میں اُلجھا رہا خیال

گزری تمام عمر اسی پیچ و تاب میں

مضمونِ ترکِ اُلفتِ دنیا جو ہے مرا

میکش کا وعظِ توبہ ہے بزمِ شراب میں

کرتا رہے حساب گناہ و ثواب کا

شک جس کو ہو ترے کرم بے حساب میں

محروم اصل ہے، اور نقل نقل ہے

عالم کہاں شباب کا دورِ خضاب میں

۳۹

کون ہے ضیا افگن چاند میں ستارے میں
آگ کس کی ہے روشن برق کے شرارے میں

جلوہ آفریں آخر ہو گیا مرے حق میں
دل کا جذب ہو جانا ہر حسیں نظارے میں

تیرے اک تبسّم سے رُوحِ زندگی شاداں
کام ہے تمام اس کا تیرے اک اشارے میں

سامنے ہے بحرِ عشق اور ہے دُعا میری
یا رہوں کنارے پر یا ہوں تیز دھارے میں

بزم نازمیں آخر بار مل گیا سب کو
کیا حُضور کا فرماں ہے تلک[1] کے بارے میں

[1] شاعر کے نام کی تخفیف

۸۰

آہ کو شعلہ بار کیوں نہ کریں | فکرِ شب ہائے تار کیوں نہ کریں
دل ہمارا ابھی تھا شگفتہ کبھی | ذکرِ فصلِ بہار کیوں نہ کریں
زندگی جب ہو باعثِ آزار | موت کا انتظار کیوں نہ کریں
اشکباری سے ہو اگر ممکن | دُور دل کا غبار کیوں نہ کریں
جو کریں رازِ عشق کو افشا | وہ انھیں وقفِ دار کیوں نہ کریں
لالہ و گُل میں حُسن ہے تیرا | لالہ و گُل سے پیار کیوں نہ کریں

یہ بھی ہے میہماں کوئی دن کا
قدرِ محروم زار کیوں نہ کریں

۴۱

کس لیے سیرِ لالہ زار کریں
دل کو کیوں اور داغدار کریں

نا اُمیدی سے ہے یہی بہتر
جھوٹے وعدوں پہ اعتبار کریں

صبر کا امتحاں ہے خوب کہ ہم
صبحِ محشر تک انتظار کریں

وائے مجبوریاں محبّت کی
جُرمِ ناکردہ اعتذار کریں

وہ ہے ناکام جو اُنھیں چاہے
جس کو چاہیں وہ کامگار کریں

نیشِ غم ہو گیا ہے نوش اب تو
اب نہ تکلیف غمگُسار کریں

دل پہ کچھ داغ اور بھی کھائیں
اس بیاباں کو لالہ زار کریں

مُدّعا ہے غزل سے کیا محروم
عاشقوں میں تمھیں شمار کریں؟

۹۲

جب دل کا حال کہہ نہیں سکتے زباں سے ہم
لیتے ہیں کام نالہ و آہ و فغاں سے ہم
واقف ہیں اک فسردگیِ جاوداں سے ہم
نا آشنا ہیں فرقِ بہار و خزاں سے ہم
خوش دل ہوئے نہ سیرِ گُل و گلستاں سے ہم
پابندِ دام اُڑ کے ہوئے آشیاں سے ہم
اُلجھا کیے بہت دلِ ناشادماں سے ہم
عہدہ برا نہ ہو سکے جب دلستاں سے ہم
کترا کے اب گزرتے ہیں کوئے بتاں سے ہم
"کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم"

کس مُنہ سے شکوہ اُن کے نہ آنے کا کیجئے

جب جا سکے نہ اُن کے نہ آنے پہ جاں سے ہم

دل مجھ سے پُوچھتا ہے کہ جائیں گے اب کہاں

میں دل سے پوچھتا ہوں کہ آئے کہاں سے ہم

خونِ جگر کے واسطے ہے شرم کا مقام

لیں نشّہ مستعار مئے ارغواں سے ہم

۴۳

کثرتِ یاس میں جو یاس رُبا ہوتا ہے
یاد ہوتی ہے تری، نام ترا ہوتا ہے
اتفاقاً بھی جہاں ذکر ترا ہوتا ہے
دلِ افسردہ میں ہنگامہ بپا ہوتا ہے
جو کچھ پیہم صِلۂ عرضِ دُعا ہوتا ہے
یوں بھی اے دُشمنِ اربابِ وفا ہوتا ہے؟
کس لیے شکوۂ آئینِ قضا ہوتا ہے
طائرِ جاں قفسِ تن سے رہا ہوتا ہے
کچھ بھی کر سکتے نہیں دیکھنے والے اُن کے
یہی کہتے ہیں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے
عالمِ یاس میں یوں ہے دلِ روشن اپنا
جس طرح گورِ غریباں پہ دیا ہوتا ہے

لائقِ تکیہ نہیں عالمِ فانی اے دل!
دیکھتے دیکھتے جو ندرِ فنا ہوتا ہے

اپنی تقدیر کو کرتا ہے وہ اپنا دشمن
جو یہ کہتا ہے کہ تدبیر سے کیا ہوتا ہے

اک مصیبت میں ہے جاں نالۂ غم سے اپنے
کہ نہ رُکتا ہے یہ ظالم، نہ رسا ہوتا ہے

ہے وہی صحبتِ مردم میں سبک روحوں کا
شہر میں آکے جو انجامِ صبا ہوتا ہے

بے رُخی کس لئے محروم صنم خانے سے
بُت میں بھی جلوہ خدا کا بخدا ہوتا ہے

پھر بہار آئی، ہُوا پھر گرم بازارِ جُنوں
شوق کے پھولوں میں پھر تُلنے لگے خارِ جُنوں

نالۂ بلبل نہیں تاثیرِ وحشت کے بغیر
چاک دامانی ہے گُل کی صاف اظہارِ جُنوں

یاد آیا میکدہ جب موجِ نسیمِ فصلِ گُل
کرتی تھی زنجیر ساں ہم کو گرفتارِ جُنوں

ناصحِ ناداں کی حالت اور ہماری ایک ہے
وہ ہے بیمارِ خرد اور ہم ہیں بیمارِ جُنوں

اہلِ دنیا کی تگ و دو دیکھ کر دیوانہ وار
ساری دُنیا مجھ کو آتی ہے نظر دارِ جُنوں

بے تامّل اے دلِ وارفتہ کر اقرارِ عشق
اعتباری ہے کہاں مجنوں کا انکارِ جُنوں

تجھ پہ وحشت کا اثر محرومؔ پھر ہونے لگا
پھر ترے اشعار میں پاتے ہیں آثارِ جُنوں

ہوائیں چلتی ہیں کیا خوشگوار ساون میں
گھٹائیں اُٹھتی ہیں کیا دجلہ بار ساون میں
جو آرزوئے تماشائے برشگال نہ ہو
پلٹ کے آئے نہ فصلِ بہار ساون میں
سماں نہیں یہ گل افشانیٔ بہار سے کم
ہے شاخ شاخ پُراز برگ و بار ساون میں
فضا ہے کیف سے لبریز، مے فروش ہوا
تلاشِ ہوش میں ہیں ہوشیار ساون میں
نہیں ہیں آپے میں اپنے چڑھے ہوئے دریا
نہ اُن کا آر ہے کوئی نہ پار ساون میں
نظر کو کرتے ہیں مسحور اے فضائے وطن
ترے لہکتے ہوئے سبزہ زار ساون میں
رُلا رُلا گئے جب یاد آ گئے محروم
وہ دَورِ عشق کے لیل و نہار ساون میں

اے تجھ سے فرازِ بام رنگیں　　ہے بلکہ فضائے شام رنگیں

اے جانِ بہار! تیرے دم سے　　گلزار ہوا تمام رنگیں

ساقی! ترا عکسِ رُخ ہے ورنہ　　صہبا رنگیں نہ جام رنگیں

پھر جوشِ بہارِ گُل ہے بُلبل　　ہر سمت بچھے ہیں دام رنگیں

بے رنگ ہے زیست تیری محروم

لیکن ہے ترا کلام رنگیں

حسیں ہے وہی جس کی سیرت حسیں ہے　　وہ ظاہر ہے کیا جس کا باطن نہیں ہے

ملی استواری اُسی کے عمل کو　　یقیں جس کا محکم ہے عزم آہنیں ہے

اُڑے لاکھ اوجِ فلک پر یہ انساں　　مقامِ آخرِ کار زیرِ زمیں ہے

ترا نام تسکیں دہِ قلبِ مضطر!　　تری یاد آرامِ جانِ حزیں ہے

گیا دَورِ عشق و جوانی ہمارا

مگر داغِ حسرت ابھی دِلنشیں ہے

۴۸

نگاہِ اوّلیں کی داستانی یاد آتی ہے
کسی نامہرباں کی مہربانی یاد آتی ہے

قریبِ شاخِ گُل ہوتی ہے جب دستاں سرا بُلبل
ہمیں بھی بُھولی بسری اک کہانی یاد آتی ہے

دلِ ناشادماں کو اور بھی ناشاد کرنے کو
دلِ ناشادماں کی شادمانی یاد آتی ہے

جوانی اور بُوئے گُل میں یارب کیا تعلّق تھا
کہ بُوئے گُل سے پیری میں جوانی یاد آتی ہے

غزل اب ختم ہو جاتی ہے اپنی پانچ شعروں پر
جوانی اور طبیعت کی روانی یاد آتی ہے

کشتۂ یاس ہوں اُمید سے کیا کام مجھے
نہ تڑپ اور نہ تڑپا دلِ ناکام مجھے

باغِ عالم میں وہ مانوسِ گرفتاری ہوں
لُطف ملتا ہے نشیمن کا تہِ دام مجھے

ہوں وہ برباد کہ قسمت میں نشیمن نہ قفس
چل دیا چھوڑ کے صیّاد تہِ دام مجھے

میں نے دیکھے ہیں بہت خونِ تمنّا کے رنگ
ساقیا! دے نہ فریبِ مئے گُلفام مجھے

کس کو دے گی غم و اندوہ مری قسمت کا
تو مٹائے گی اگر گردشِ ایّام مجھے

پاتے ہیں درد کی تاثیر اسی نام سے شعر
باعثِ فخر ہے محروم مرا نام مجھے

۵۰

کردیا قیدِ قفس نے وقفِ حیرانی مجھے
اب کہاں اے ہمنوا! ذوقِ پرافشانی مجھے
دے کے ذوقِ نغمۂ مرغِ گلستانی مجھے
کردیا حیرت نشینِ کنجِ ویرانی مجھے
قائلِ احساں نہ کر اے عالمِ فانی مجھے
تجھ سے کیا حاصل ہوا غیر از پشیمانی مجھے
حلقۂ غم ہوگیا ہر لحظہ میری عمر کا
زندگی اپنی ہوئی زنجیرِ طولانی مجھے
کیوں نہ دوں تیغِ نگاہِ ناز کو دل میں جگہ
کیا نہیں شوقِ جراحت ہائے پنہانی مجھے
تیری زُلفوں کی پریشانی سے دل آسودہ ہے،
کاش ایسی ہی کوئی ہوتی پریشانی مجھے

آئینہ سیما نمودِ سیمیا ثابت ہوئے
کر دیا ذوقِ نظر نے وقفِ حیرانی مجھے

تیرے نظّارے بھی ہیں اے شامِ غربت دلفریب
یاد ہے لیکن وطن کی صبحِ نُورانی مجھے

محشرِ جذبات ہے غالبؔ کی یہ ساری غزل
گو نہیں محروم دعوائے سخندانی مجھے

خاص کر یہ مصرعۂ دل کش نشاط انگیز ہے
"پھر ہُوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے"

پہلو میں دل ہے دُر دکی دُنیا کہیں جسے
پر اس قدر اُجاڑ کہ صحرا کہیں جسے

وہ رُعبِ حُسن تھا کہ بن آئی نہ ہم سے بات
یوں حالِ دل کہا کہ نہ کہنا کہیں جسے

آنکھوں سے دیکھنے کو تو اب بھی ہیں دیکھتے
تھی اور چیز ذوقِ تماشا کہیں جسے

مانندِ ماہ اُس کا فلک پر دماغ ہو
جھوٹوں بھی تابِ حُسن میں تم سا کہیں جسے

سب آپ کے تغافل و جور و جفا بجا
ہے ایک اپنا شکوہ کہ بےجا کہیں جسے

ذوقِ سخن کے دن بھی تھے شاید وہی کہ جب
دل میں کسک تھی دردِ تمنّا کہیں جسے

محرومؔ شاعروں میں بہت نامور نہیں
اتنا ضرور ہے کہ سب اچّھا کہیں جسے

۵۲

دلِ بے قرار کے ہاتھ سے مجھے کاش! چین کہیں ملے
کہوں اپنی موت کو مرحبا، جو قرار زیرِ زمیں ملے

کوئی پل کے آپ سے خوش ہو کیا کہ یہی طریق ہے آپ کا
سرِ راہ، وہ بھی کبھی کبھی، جو ملے تو چیں بہ جبیں ملے

ہو کہاں جنونِ وفا مرا، نفسِ شکیب سے آشنا
نہ زمیں میں اُنس کی آب وگِل، نہ مزاجِ چرخِ بریں ملے

ترا ملنا گرچہ محال ہے، یہ اُمیدِ خواب و خیال ہے
وہ ہے خوش نصیب جسے یہاں تری آرزوئے حسیں ملے

تری قسمت اے تلکؔ حزیں، تُو یہ جانتا ہے رسا نہیں
تجھے کیوں یہ ضد ہے کہ وہ ملیں جو کبھی کسی سے نہیں ملے

لہ مصنّف کے نام کی تخفیف

۵۳

لالہ کاریِ محبّت نہ رہی — کہ لہو رونے کی عادت نہ رہی

مر گئیں آرزوئیں گھُٹ گھُٹ کر — دل میں اب ایک بھی حسرت نہ رہی

دلِ افسردہ کو کیا گرمائیں — گرمیِٔ ذوقِ محبّت نہ رہی

شاق تھی پہلے پہل تو مگر اب — بے دلی باعثِ وحشت نہ رہی

سحر و شام کے نظّاروں میں — وہ صباحت وہ ملاحت نہ رہی

دل پہ ہے داغ کہ اب ذوق انگیز — شفقِ شام کی رنگت نہ رہی

کبھی بہلاتی تھی دل کو آکر — کیوں وہ اُمّید کی عادت نہ رہی

موت تھی تیری جدائی ہم کو — زہر کھانے کی ضرورت نہ رہی

شاعری نام تھا اک حالت کا
اب وہ محرومؔ کی حالت نہ رہی

۵۴

کب مری آہ چرخ پر نہ گئی — تا درِ دستاں مگر نہ گئی

مجھ کو تڑپا گئی مری فریاد — اور تو کوئی کام کر نہ گئی

تُو نہ آئی تو کیا ہوا اے موت — کیا شبِ غم مری گزر نہ گئی

مرگِ غربت ملی سکندر کو — آہ دارا کی بے اثر نہ گئی

سیرِ گلشن سے کیا ہوا حاصل — رنگ و بُو سے پرے نظر نہ گئی

جانِ بے تاب کو سکوں نہ ملا — بے کلی دل کی عمر بھر نہ گئی

ذوقِ نظّارہ ہو چکا محروم
نسبتِ ابرو چشمِ تر نہ گئی

۵۵

مایوس ہو کے میری بے ربطیٔ بیاں سے

مانُوس ہو گیا دل ہنگامۂ فغاں سے

ہوتے ہیں جس جہاں پر قرباں ہزار جاں سے

کھاتے ہیں داغِ حسرت آخر اُسی جہاں سے

دیر و حرم کے جھگڑے سب دُور ہیں یہاں سے

دنیا الگ ہے اپنی دُنیائے این و آں سے

دل بستگی بڑھا کر غم خانۂ جہاں سے

آئے پلٹ پلٹ کر دنیائے جاوداں سے

آفاقِ رنگ و بُو میں عنقا ہے دل نوازی

بے گانہ گوشِ گُل ہے بلبل کی داستاں سے

جانِ جہاں وہ خود ہے اور جسم دہرِ فانی

قائم نظامِ عالم ہے ربطِ جسم و جاں سے

وہ بھی تری عنایت، یہ بھی تری عنایت

باران و برق دونوں آتے ہیں آسماں سے

کیا دوزخی نظارے دکھلائے ہیں فلک نے

انساں پہ آگ انساں برسائے آسماں سے

وحشت کے ہاتھ بِک کر کیا کر رہا ہے انساں

ویرانہ بن رہے ہیں بازار کہکشاں سے

پاتے ہیں اہلِ دل بھی مضموں پسندِ خاطر

اہلِ زباں بھی خوش ہیں محروم کی زباں سے

باعثِ تسکیں ہے نیرنگِ فنا میرے لئے
ایک دن یعنی ہے غم کی انتہا میرے لئے

ہر ستارے کی چمک ہے حق نما میرے لئے
ہو گیا رہبر فریبِ ماسوا میرے لئے

کون لائے اب غمِ صدماتِ ناکامی کی تاب
چاہیئے دل بے نیازِ مدّعا میرے لئے

دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا؟ کیوں ہو گئی
وہ نگاہِ آشنا نا آشنا میرے لئے

وائے ناکامی کہ بعدِ مرگ یہ ظاہر ہوا
تھی ضمیرِ دوست میں مضمر وفا میرے لئے

یاد جب بھی آ گئی تیری نگاہِ اوّلیں
کھل گیا اک دفترِ مہر و وفا میرے لئے

اب تو ہے محرم اک اجڑی ہوئی محفل یہ دہر
وہ بھی دن تھے جب یہ بزمِ ناز تھا میرے لئے

۵۷

حقیقت کیا ہے دُنیا کی، یہ دُنیا نقشِ باطل ہے
مگر اس نقشِ باطل میں فسونِ حُسن شامل ہے

سکوں دل کے لئے معمورۂ ہستی میں مشکل ہے
جدھر اُٹھتی ہیں نظریں، حُسنِ بے پروا مقابل ہے

کسی قابل نہیں ہیں ہم، مگر یہ فخر حاصل ہے
کہ دل اپنا غمِ بیتابیٔ اُلفت کے قابل ہے

سکوں نا آشنا بعدِ فنا بھی جانِ بسمل ہے
ملال افزا خیالِ زحمتِ بازوئے قاتل ہے

اسیرِ کشمکش ہائے اُمید و بیم ہوں، ورنہ
نہ جینے میں ہے دشواری، نہ مرنا کارِ مشکل ہے

جو دانا ہیں بتانِ ماہوش سے دُور رہتے ہیں
کہ فطرت میں جنوں پرور فروغِ ماہِ کامل ہے

ایک دن ہے اتحادِ جسم و جاں کا خاتمہ
ہے وہی تیرے لئے اے دل جہاں کا خاتمہ

زندگی ناکامیوں کی اک مسلسل داستاں
موت کیا ہے زندگی کی داستاں کا خاتمہ

خاک ہو کر بھی ہوئے آوارۂ دشتِ بلا
کب ہوا اہلِ وفا کے امتحاں کا خاتمہ

کوئی پستی سے نہ ہو نادم، نہ نازاں اوج پر
ایک دن ہو گا زمین و آسماں کا خاتمہ

اے دلِ غمدیدہ، خوش ہو جا کہ ہو جانے کو ہے
زندگی کے ساتھ غمہائے نہاں کا خاتمہ

آرزوئیں ہو نہیں سکتیں جہاں میں کامیاب
لازم اس صحرا میں ہے ہر کارواں کا خاتمہ

شعر میں باقی نہیں وہ رنگِ جذباتِ شباب
ہو گیا محروم اب حسنِ بیاں کا خاتمہ

۵۹

بے رونقی کا رنگ مری چشمِ تر میں ہے

خُوں میں ہے اب وہ جوش، نہ وہ خُوں جگر میں ہے

پروانہ جس کا میں ہوں، جو میری نظر میں ہے

وہ نُور شمع میں ہے، نہ شمس و قمر میں ہے

وہ بے قرار دل مرے پہلو میں ہے، جسے

دشتِ سفر میں چین، نہ آرام گھر میں ہے

عالم رواروی کا ہے آٹھوں پہر یہاں

دُنیا میں ہے بشر، کہ مسافر سفر میں ہے

کچھ کم نہیں سیاہیٔ شامِ فراق سے

سایہ وہ یاس کا جو ہماری سحر میں ہے

انسانیت کی منزلِ مقصود ہے کہاں

صدیاں گزر گئیں یہ ابھی رہ گزر میں ہے

ہے اک ادائے ناز کسی کا غرور بھی

سچ ہے کہ عیبِ حُسن بھی شامل ہُنر میں ہے

ابتر ہوا علاج سے حالِ مریضِ عشق

ہر روز داغِ تازہ دلِ چارہ گر میں ہے

محروم دل سے عشق کے جذبات تو گئے

شورِ غزل سرائیٔ ابھی میرے سر میں ہے

متفرق اشعار

آئی صبحِ بہار اے بلبل — وقت ہے تیری نغمہ خوانی کا
حسرتِ خُفتہ کو جگاتا ہے — ذکر پیری میں نوجوانی کا
چند روزہ طلسم ہے لیکن — خوب جلوہ ہے دہرِ فانی کا

ہم نہ سمجھے کہ دلبری اُن کی
اک بہانہ تھا جانستانی کا

کمالِ عشق مُسلّم ہے ضبط والوں کا
نہیں زمانہ یہ آہوں کا اور نالوں کا

نہ قہقہے نہ ترانے ہیں بزمِ عشرت میں
الم اُنھیں بھی ہے شاید شکستہ حالوں کا

دہانِ زخم سے میرے دُعا نکلتی ہے
"خُدا بھلا کرے آزار دینے والوں کا"

جنابِ نازؔ[1] نہ مجھ کو لکھیں خدائے سخن
غلامِ خاک نشیں ہوں میں باکمالوں کا

اثرِ کاوشِ وفا نہ ہوا مر مٹے ہم، وہ آشنا نہ ہوا
آئینہ کیا جو ہو نہ عکس پذیر دل وہ کیا ہے جو حق نما نہ ہوا
حرفِ مطلب نہ رُک سکا ہرگز بن گیا نالہ جب ادا نہ ہوا
مجھ کو محرومِ التفات رکھا
فائدہ اس میں آپ کا نہ ہوا

ماجرا بیتابیٔ دل کا بیاں کرتے رہے
جب تلک جیتے رہے مشقِ فغاں کرتے رہے
اب جہاں میں اُن کی قبروں کے نشاں ملتے نہیں
عمر بھر جو فکرِ تسخیرِ جہاں کرتے رہے
چار تنکے باغ میں اپنے بھی رہنے دے کہ ہم
انتظارِ فصلِ گُل اے باغباں کرتے رہے

[1] جناب نانک چند نازؔ نے ایک دفعہ اپنے اخبار میں میرے نام کے ساتھ خدائے سخن لکھ دیا تھا۔ (محرومؔ)

نقشِ ہستی اپنا پھیکا ہی رہا، ہر چند ہم!
دیدۂ خوں بار سے گُل کاریاں کرتے رہے

موجِ کشتی بھی ہے طوفاں بھی ہے، از بحرِ حباب
زندگی پر خوش نہ ہولے کامرانِ زندگی

ہم نشیں مجھ کو نہ فرضی غم کے افسانے سُنا
مجھ کو کافی ہے یہ میری داستانِ زندگی

کاوشیں ہی کاوشیں ہیں، راحتوں کا ذکر کیا
زندگی میرے لئے ہے امتحانِ زندگی

زندگی خود میہماں اس عالمِ فانی میں ہے
ہم بہ اُمیدِ مُدارا میہمانِ زندگی

اہلِ ہوا نہیں ہیں فقط آج کم نصیب
روزِ ازل سے جام نگوں ہے حباب کا

مَیں اور جلوہ گاہ تری اے خوشا نصیب
ذرّے کو آج رتبہ ملا آفتاب کا

عالم میں ہم تو وقفِ غم و یاس ہی رہے

چرچا بہت سُنا کیے گو انقلاب کا

محروم کچھ بُرا نہ ہوا، جا چکا اگر!

تھا دَورِ غفلتوں کا زمانہ شباب کا

دہنِ گور کا لقمہ ہے یہ تن کِس کا ہے

رُوح مرتی نہیں پھر رنج و محن کِس کا ہے

کب ملا چین وطن میں دلِ ناشاد تجھے

ڈر دکیوں تجھ کو وطن کا ہے وطن کس کا ہے

ہَدَفِ ناوکِ صیّاد ہوا پھر کوئی

ماتم اے نوحہ سرایانِ چمن کس کا ہے

اس غزل میں نہ تخلّص نہ کسی کا ہے نام

خود سمجھ جایئے اندازِ سخن کس کا ہے

حُسنِ پنہاں ایک ہے اور اُس کے مظہر بے شمار

پرتوِ خورشید سے روشن ہیں اختر بے شمار

میرے مسلک میں اُسی خالق کے بندے ہیں تمام
حضرتِ واعظ کے مذہب میں ہیں کافر بے شمار

یہ شبِ اوّل ہے فرقت کی سنبھل کر رو ذرا
ایسی راتیں آئیں گی اے دیدۂ تر، بے شمار

دردِ دل، سوزِ جگر، اشکِ رواں، داغِ فراق
سچ تو یہ ہے آپ کے احساں ہیں مجھ پر بے شمار

فتنہ آرا شورشِ اُمّید ہے میرے لئے
نااُمیدی راحتِ جاوید ہے میرے لئے

دیکھتا ہوں ہر کہیں حُسنِ ازل کا انعکاس
ذرّہ ذرّہ غیرتِ خورشید ہے میرے لئے

صاف آتا ہے نظر انجام ہر آغاز کا
زندگانی موت کی تمہید ہے میرے لئے

جاگ اُٹھتی ہے تہِ دامانِ شب سے صبحِ نو
موت کیا ہے زیست کی تجدید ہے میرے لئے

جو وہ غم خوار ہو جائے تو غم کیا! زمانہ کیا، زمانے کے ستم کیا
مرا ہونا نہ ہونا ہے برابر نشاطِ ہستی و خوفِ عدم کیا

شہیدِ یک نظر ہوں گے دل و جاں
ہماری آرزو کیا اور ہم کیا

دلِ میں طوفانِ تمنا نظر آتا ہے مجھے
قطرہ ہوتا ہوا دریا نظر آتا ہے مجھے

کیا ارادہ ہے شبِ غم ترا اے جانِ حزیں
دلِ بے تاب تو جاتا نظر آتا ہے مجھے

کون سے پردے میں وہ پردہ نشیں ہے یارب
پردہ اُٹھتا ہے تو پردا نظر آتا ہے مجھے

تیری نگاہِ ناز کو دل کی تلاش ہے
پہلو میں دل کہاں ہے مرے دل کی لاش ہے

شیریں جو سنگدل ہے تو فرہاد شکوہ کیا
تو بھی کہاں کا موم ہے، خارا تراش ہے

محرومؔ! میں وہ کشتۂ غم ہوں بقولِ ذوقؔ
"دل جس کا پارہ پارہ جگر پاش پاش ہے"

شعلہ افروز جو سوزِ دلِ پروانہ ہوا
شمعِ محفل کا عیاں جلوۂ جانانہ ہوا

فائدہ ہوتا ہے دنیا میں بقدرِ نقصاں
دل کے خوں ہوتے ہی رنگیں مرا افسانہ ہوا

غافلو! جاگ اُٹھو، دَور گیا مستی کا
عصرِ نو درپئے بربادیٔ مے خانہ ہوا

طبیعت مائلِ ذوقِ جفا معلوم ہوتی ہے
کہ اُن کی بے وفائی بھی وفا معلوم ہوتی ہے

نہ پایا ذوقِ جاں ہم نے تری بزمِ محبت میں
گئی جانِ حزیں اور ابتدا معلوم ہوتی ہے

ہوا ہے صرفِ تزئینِ خونِ دل ہائے جہاں اس میں
اسی سے بزمِ ہستی خوشنما معلوم ہوتی ہے

ہوئیں نہ روئے حقیقت سے آشنا آنکھیں
کہ ہم اسیرِ خمِ گیسوئے مجاز رہے

سرِ نیازِ خم اور دوش فارغ از احساں
جو یوں رہے وہی دنیا میں سرفراز رہے

زمانہ ملتا ہے اے دل زمانہ سازوں سے
تجھے خلوص پہ گر ناز ہے تو ناز رہے

اس پہ کیا نکتہ چیں ہوں اہلِ زباں   اہلِ دل کی زبان اور ہی ہے
کامیابی یہاں ہے ناکامی   عشق کا امتحان اور ہی ہے

ہم وہی ہیں، وہی طریقِ وفا
بدگماں کو گمان اور ہی ہے

بشر کو چاہیئے دل پر نہ اعتبار کرے
خرد کو خلوتِ جاں میں شریک کار کرے

نہیں یہ دورِ جہاں اعتبار کے قابل
وہ ناشناس ہے اس کا جو اعتبار کرے

کسی کے جور و ستم سے نہ دل پریشاں ہو
اگر یہ شیوۂ تسلیم اختیار کرے

سر پھرنے کی آفت سے بچیں اہلِ زمیں کیا
مجبور ہیں مجبور، کہ گردش میں زمیں ہے

اک پردۂ غفلت مری آنکھوں پہ ہے ورنہ
میں پردے کے باہر ہوں نہ تو پردہ نشیں ہے

دل معتقدِ دیر و حرم گو نہیں اپنا
پھر بھی تری رحمت سے یہ مایوس نہیں ہے

ذوقِ مستی مرا محتاجِ مے و جام نہیں
گر نہیں بادۂ گلگوں شفقِ شام تو ہے

دلِ ناداں کی بدولت ہے جو رسوائی ہے
بد دعا اور اسے کیا دوں کہ یہ ناکام تو ہے

اُنسِ دیرینہ ہے مجھ کو سخن آرائی سے
نہ سہی کام کی یہ چیز، مگر نام تو ہے

دلِ ناداں ہے اُن جلوؤں کا طالب
جو بالا ہیں مرے وہم و گماں سے

کہاں افسانۂ ہستی کا آغاز
سناتے آئے ہیں سب درمیاں سے

تمھارے آستاں پر خاک میری
زمیں ٹکرا رہی ہے آسماں سے

یہاں میں و دشمنِ نشو و نما ہے سایۂ احساں
نہیں بڑھتا جو ہو جائے شجر زیرِ شجر پیدا

تری قدرت پہ قرباں ہوں تری صنعت پہ حیراں ہوں
کیئے ہیں شاخ ہائے خشک سے گل ہائے تر پیدا

قفس میں ہیں تو یادِ آشیاں ہے
مگر خوفِ قفس تھا آشیاں میں

سکوں کب ہے تری قسمت میں اے دل
رہا بیتاب بزمِ دوستاں میں

کوئی خدمت نہ کی ہندوستاں کی
رہیں کس منہ سے ہم ہندوستاں میں

بیدار کے لئے نہیں ممکن اگرچہ خواب

جو کچھ ہے خواب ہے دلِ بیدار کے لئے

ساحل گرا کے خود بھی مکدّر ہے موجِ یم

تسکینِ دل کہاں ہے ستمگار کے لئے

محرومؔ ان میں کیا ہے کہ رہتے ہیں رات دن

احباب منتظر ترے اشعار کے لئے!

ہر اوجِ ظاہری دُنیا میں ہے پستی گزیں آخر

فلک پر اُڑنے والوں کا بھی ہے مسکن زمیں آخر

طلسمِ ہستیِ فانی ہے شوق انگیز و حسرت زا

مثالِ وعدۂ معشوق ہاں اوّل، نہیں آخر

ترے در پر مناسب ہے اسے خاک آشنا کرنا

کہ جزوِ خاک خود ہو کر رہے گی یہ جبیں آخر

اب ترے بس کا نہیں جوشِ جنوں اے چارہ گر

دشت میں مجنوں سے آگے دو قدم لیلیٰ ہے آج

تجھ سے راحت چھین لی جائے گی کل اُس کے لئے
اے دلِ راحت طلب! جو طالبِ ایذا ہے آج
دامنِ فردا میں ہوگا کیا نہ غم تیرے لئے
اے دلِ ناداں عبث تجھ کو غمِ فردا ہے آج!

کیا ضرورت ہے جھگڑنے کی بہم اے واعظ
حرمِ کعبہ ترا، دیرِ برہمن میرا
باعثِ بیم و رجا ذوقِ نوا میرا ہے
باغباں دوست نہ صیاد ہے دشمن میرا
ہوسِ گُل میں بڑھایا نہ کبھی میں نے ہاتھ
نہ کسی خار سے اُلجھا کبھی دامن میرا

ظلمتِ یاس ہے وہی، داغِ جگر کو کیا کروں
غم کی گھٹا نہ کھُل سکی، آہِ سحر کو کیا کروں
اشکِ رواں نہ ایک دن دل کی لگی بجھا سکے
گریۂ غم سے کیا ملا، دیدۂ تر کو کیا کروں

جلوۂ برقِ حسن ہے دشمنِ خرمنِ قرار
دل کو بچاؤں کس طرح؟ ذوقِ نظر کو کیا کروں

ہر قدم پر جستجوئے جلوۂ جانانہ ہے
پھر دلِ سوزاں حریفِ جراَتِ پروانہ ہے
اب نصیبِ دشمناں ہے نالۂ شامِ فراق
شش جہت میرے لئے خلوت گہِ جانانہ ہے

آئے تھے ہم بھی ذوقِ تماشا لئے ہوئے
جاتے ہیں دل میں داغِ تمنا لئے ہوئے
دل ایک قطرہ "بحر در آغوش" ہے کوئی
ذرّہ ہے یا کنار میں صحرا لئے ہوئے

جس دن سے خاکِ راہِ فنا ہو گیا ہوں میں
قیمت میں کیمیا سے سوا ہو گیا ہوں میں

بت خانے سے غرض ہے نہ کعبے کی احتیاج
ہونا تھا جو مجھے، بخدا ہو گیا ہوں میں

گزرتی جا رہی ہے زندگی اور رُوح شاداں ہے
مسافر کے لئے کمتر مسافت ہوتی جاتی ہے
خود اپنی بے بسی کا راز مجھ پر کُھلتا جاتا ہے
مجھے اب زندگی سامانِ راحت ہوتی جاتی ہے

کس زباں سے یہ کہوں میں کہ خطا کار نہیں
حد گناہوں کی مرے اے مرے غفّار نہیں
کون سے ملک میں دولت نہیں دلدادہ حسن
حُسن کس شہر میں دولت کا پرستار نہیں

ذرّاتِ خاک بن نہیں جاتے نجوم کیوں
حیرت سے دیکھتا ہوں تری رہگذر کو میں

محروم تیرے دل کی تسلّی کے واسطے
الزام دے رہا ہوں کسی کی نظر کو میں

بعدِ شباب داغ دلِ داغدار کے!
میری نظر میں پھول ہیں جاتی بہار کے
محروم مجھ سے کہتے ہیں یوں جلوہ ہائے حُسن
پنڈی[1] میں آپ آئے جوانی گزار کے

موت سے بدتر اسیری اے اسیرِ دام ہے
فکرِ آزادی ہی تیری زندگی کا نام ہے
تُو نہ ہو ساقی تو میخانہ ہے اک ماتم کدہ!
اشکِ حسرت بادہ ہے اور چشمِ حیراں جام ہے

بادِ بہار تجھ سے اُمیدِ نشاط کیا
بس اس قدر کہ زخمِ کہن کو ہرا کرے

[1] راولپنڈی

حالت وہ دل کی اب ہے کہ گزرا زباں سے کام
میری نگاہِ یاس ہی اُس کو ادا کرے

نالۂ جاں گُداز ہوں سوزِ غمِ فراق سے
تم ہو اگر انیسِ جاں، نغمۂ دل نواز ہوں
بُلبلِ خوش نوا ہوں میں، صحنِ چمن سے دُور ہوں
بزمِ سخن سے دُور ہوں، گرچہ سخن طراز ہوں

خلوتِ ناز میں چھپ کے سنورنے والے
مر گئے حسرتِ دیدار میں مرنے والے

کیا ثباتِ عمر جس پر اس قدر نازاں ہے تُو
کیا خبر رُک جائے کب وہ سانس جو سینے میں ہے

خود بھی جلتی ہے، اگر اس کو جلاتی ہے یہ
کم کسی طرح نہیں شمع بھی پروانے سے

مضطر ہے برق، تاک میں صیّاد عندلیب
دلبستگی بہت نہ رہے آشیاں کے ساتھ

دورِ اوّل

سنہ ۱۹۰۶ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک

۱

ہر سمت اک ظہور ہے تیرے جمال کا

تو نُورِ شرق و غرب و جنوب و شمال کا

ماہِ تمام نیم تبسّم ہے اک ترا

خورشید ایک شمّہ ہے تیرے جلال کا

پائی ہے تجھ سے چشم کو اک نئی روشنی

تمغہ دیا ہے بدر کو تُو نے کمال کا

دیتا ہے ناتواں کو توانائیِ عروج

اوجِ فلک سے ہے یہ اشارہ ہلال کا

تو ہے نہاں مگر ترے جلوے کہاں نہیں

ہر لختِ سنگ آئینہ تیرے جمال کا

خود اُس کے حُسن کو بھی تماشا کرے کوئی

صانع جو روئے گُل کا ہے چشمِ غزال کا

محروم اک اُمید پہ ہوں گرمِ جستجو

"لَا تَقْنَطُوا" جواب ہے میرے سوال کا

۲

شب محفلِ عدو میں جو وہ ہم سے دُور تھا
دستِ رسائے شوق، یہ کس کا قصور تھا

دکھلائی کیوں نہ شعلۂ رُخسار کی جھلک
گر تم کو میرے جی کا جَلانا ضرور تھا

اظہارِ شوقِ دید پہ عذرِ حجاب ہے
ہاں پھر وہ کس کا جلوہ سرِ کوہِ طُور تھا

پہلے ہی دَور میں ہوئے ہوش و حواس گُم
توبہ شرابِ عشق میں کتنا سُرور تھا

حُسنِ کلام صدقۂ ذوقِ جمال ہے
محروم شاعری کا ہمیں کب شعور تھا

۳

ہمارے واسطے ہے ایک جینا اور مر جانا
کہ ہم نے زندگی کو جادۂ راہِ سفر جانا

یکا یک منزلِ آفاتِ عالم سے گزر جانا
ڈریں کیوں موت سے جب ہے اِسی کا نام مر جانا

تری نظروں سے گِر جانا، ترے دل سے اُتر جانا
یہ وہ اُفتاد ہے جس سے بہت اچھا ہے مر جانا

جوابِ ابرِ نیساں تجھ کو ہم نے چشمِ تر جانا
کہ ہر اک قطرۂ اشکِ چکیدہ کو گہر جانا

تلاطم آرزو میں ہے، نہ طوفاں جستجو میں ہے
جوانی کا گزر جانا ہے دریا کا اُتر جانا

ہم اپنے رہزن و رہبر تھے، لیکن سادہ لوحی سے
کسی کو راہزن سمجھے، کسی کو راہبر جانا

میں ایسے راہرو کی جستجو میں مر مٹا جس نے
تنِ خاکی کو راہِ عشق میں گردِ سفر جانا

لبِ بام آئے تم اور اُن کے چہرے ہو گئے پھیکے
قمر نے تم کو خورشید اور ستاروں نے قمر جانا

نہ بھولے گا ہمیں محرومِ صبحِ روزِ محشر تک
کسی کا موت کے آغوش میں وقتِ سحر جانا

۴

جس پہ رندوں کو گمانِ لغزشِ مستانہ تھا
پائے ساقی پر وہ اپنا سجدۂ شکرانہ تھا

دشت پیمائے جنوں تھا کوئے لیلیٰ چھوڑ کر
عاشقِ صادق ہُوا ہے قیس، پر دیوانہ تھا

نام کوثر رکھ دیا ہم سے چھپانے کے لئے
بزمِ واعظ میں بھی ذکرِ عشرتِ میخانہ تھا

بے تحاشا کون پڑتا ہے پرائی آگ میں
سوزِ اُلفت کا ہیولیٰ تھا، کہاں پروانہ تھا

سرد مہریہائے خُوباں سے ٹھٹھر کر رہ گیا
ورنہ دِل اپنا شرارِ ذوقِ بے تابانہ تھا

ہم نشیں! مجھ سے نہ کر ذکرِ فراغتہائے زیست
دام کے نیچے مری قسمت کا دانہ دانہ تھا

وصل سے کچھ بھی نہ تھی کم رونقِ شبہائے ہجر!
شمعِ شامِ غم خیالِ جلوۂ جانانہ تھا

وسعتِ وحشت کی تجھ سے کیا کہیں اے قیس ہم
جو ترا ویرانہ تھا، اپنا وہ خلوت خانہ تھا

بختِ خوابیدہ کی تاثیرِ نہاں سے سو گئے
ورنہ خواب آور کہاں محروم کا افسانہ تھا

۵

سرِ مدفن مرے جوشِ بہارِ نرگستاں تھا
کہ وقتِ نزع بھی مجھ کو خیالِ چشمِ جاناں تھا
وہیں تک ضبطِ وحشت ہیں دلِ بیتاب کوشاں تھا
ترے کوچے سے ہم نکلے، تو پھر کوسوں بیاباں تھا
اٹک رہنا قیامت تھا، نکلنا دشمنِ جاں تھا
یہ پیکاں تھا کسی کا، یا ہمارے دل کا ارماں تھا
رُخ و گیسو کو تیرے دیکھ کر کیا کوئی خوش ہوتا
وہ حیرانی کا باعث، یہ پریشانی کا ساماں تھا
مری تحریرِ قسمت کے لئے او کاتبِ قسمت
بجائے روشنائی کیا، سوادِ شامِ ہجراں تھا

۶

حیرت زدہ میں اُن کے مقابل میں رہ گیا
جو دل کا مُدّعا تھا، مرے دِل میں رہ گیا

خنجر کا وار کرتے ہی قاتل رواں ہوا
ارمانِ دید، دیدۂ بسمل میں رہ گیا

جتنی صفا تھی سب رُخِ جاناں میں آگئی
"جو داغ رہ گیا مہِ کامل میں رہ گیا"

اے ہمرہانِ دشتِ محبت چلے چلو
اپنا تو پائے شوق سلاسل میں رہ گیا

وحشت فزا بہت تھی ہوا دشتِ قیس کی
پردہ کسی کا پردۂ محمل میں رہ گیا

محروم دل کے ہاتھ سے جاں تھی عذاب میں
اچھا ہوا کہ دوست کی محفل میں رہ گیا

۷

زہے قسمت! اگر تم کو ہمارا دل پسند آیا
مگر یہ داغ کیوں کر اے مہِ کامل پسند آیا

کیا ہے قتل، لیکن دیکھئے جاں کب نکلتی ہے؟
کہ اُن کو رقصِ بیتابانۂ بسمل پسند آیا

جو مومن بھی ہے، مانگے گا دُعا صدقِ تمنّا کی
ترے ہاتھوں سے مرنا جس کو اے قاتل پسند آیا

نہ پوچھو کب سے میں شامل ہوا ہوں تیرہ بختوں میں
کسی کے عارضِ روشن کا جب سے تِل پسند آیا

یہ گستاخی ہے اے محرومؔ، اپنی حد سے بڑھنا ہے
کہ تا حدِ زمینِ غالبِ مشکل پسند آیا

شُہرہ تمھارے حُسن کا اب عام ہوگیا
رکھیو معاف، گر کوئی بد نام ہوگیا

اے دل ترے طفیل ہوں مشہور عشق باز
تو نے کیا تھا کام، مرا نام ہوگیا

چشمِ بُتاں میں ہے کوئی تسخیر کا عمل
جس پر پڑی نگاہ، وہی رام ہوگیا

مر ہی گیا خوشی سے میں سن کر پیامِ دوست
پیغامِ وصل موت کا پیغام ہوگیا

پھرنے میں کس لئے نہیں آتے ہیں دن مرے
کیا بند دورِ گردشِ ایام ہوگیا

اے دل یہ کیا فسردگی آغازِ عشق ہیں
گُل کیوں ترا چراغ سرِ شام ہوگیا

محروم کو بھی طاعتِ خالق پہ ناز تھا
سنتے ہیں اب تو بندۂ اصنام ہوگیا

۹

محروم فصلِ گُل کا ہمیں انتظار کیا
زندہ کرے گی مُردوں کو بادِ بہار کیا

تم سے رکھے اُمید کوئی خاکسار کیا؟
دامن پہ رہ سکا ہے کسی کا غبار کیا؟

ہم خوش ہوں اے تصوّرِ مژگانِ یار کیا
راحت فزائے دل ہو کلیجے کا خار کیا

ہو دَورِ غم کہ عہدِ خوشی دونوں ایک ہیں
دونوں گذشتنی ہیں، خزاں کیا بہار کیا

پژمردہ جب سے ہے دلِ غمدیدہ کی کلی
میرے لئے ہیں ایک، خزاں کیا بہار کیا

پہلی سی وہ تڑپ ہے، نہ پہلا سا اضطراب
پہلو میں مر گیا ہے دلِ بیقرار کیا

دل خوش ہوا خرامشِ بادِ نسیم سے
یاد آگئی نزاکتِ رفتارِ یار کیا؟

اُس سحرِ فن کے پاس سناں تھی نہ تیر تھا
پھر ہو گیا الٰہی کلیجے کے پار کیا؟

ہم بے کسوں سے سختیٔ عہدِ فراق پوچھ
اے بےخبر کسی سے بڑھا تھا ہے پیار کیا؟

حُسنِ بُتاں ہے مایۂ ہستی سو بے ثبات
مانگیں دعائے زندگیٔ پائدار کیا؟

آئے گا اب نہ وہ گُلِ خنداں نظر کہیں
محروم فصلِ گُل کا ہمیں انتظار کیا؟

۱۰

پردہ جو اُٹھے تری جبیں کا ۔۔۔ شرمندہ ہو چاند چودھویں کا

کم بخت کے پیچھے کس کو بھیجوں ۔۔۔ قاصد بھی تو ہو رہا وہیں کا

مثبت ہے نفی نفی، تو مطلب ۔۔۔ ہاں ہو گا تری نہیں نہیں کا

دے ہاتھ سے گر وہ رشکِ شیریں ۔۔۔ ہو زہر میں لطف انگبیں کا

حیرت میں ہوں دیکھ بتکدے کو ۔۔۔ اللہ! یہ گھر ہے کس مکیں کا

دیکھو تو ضیائے ماہ و خورشید ۔۔۔ پرتو ہے تمام اک حسیں کا

آرام کہیں نہیں ہے دل کو ۔۔۔ ہر وقت خیال ہے وہیں کا

تُربت پہ مری اُگے گی سُنبل ۔۔۔ کُشتہ ہوں میں زلفِ عنبریں کا

ہے روزِ ازل سے تیرہ قسمت ۔۔۔ عاشق تری چشمِ سُرمگیں کا

محروم ہے، اور بے خودی ہے
دنیا کا خیال ہے نہ دیں کا

۱۱

مرا حالِ غم ہے سُنانے کے قابل — نہیں پر ابھی تم رُلانے کے قابل

اُٹھانے کے قابل ہیں سب ناز تیرے — مگر ہم کہاں ناز اٹھانے کے قابل

مجھے دیکھ کر آج مقتل میں بولے — یہ عاشق بھی ہے آزمانے کے قابل

مزا غم میں کچھ بوالہوس کو نہ آیا — یہی ایک نعمت تھی کھانے کے قابل

سمجھ لو، کہ دل ہو گیا گھر خدا کا — ہوا جب بتوں کے بسانے کے قابل

سُنے کون سرحد[۱] میں محروم ان کو
ترے شعر ہیں داد پانے کے قابل

۱۲

ستم کوئی نیا ایجاد کرنا — تو مجھ کو بھی مری جاں یاد کرنا

قیامت ہے دلِ نالاں قیامت — ترا رہ رہ کے یہ فریاد کرنا

چلو اب لطف ہی کو آزماؤ — تمھیں آتا نہیں بیداد کرنا

مرے کو مارنا ہے او ستمگر — شہیدِ ناز پر بیداد کرنا

اسیرِ زلف ہے محروم اُن کا
جنھیں آتا نہیں آزاد کرنا

۱ شمالی مغربی سرحدی صوبہ (قبل از تقسیم)

بدنام ہوں پر عاشقِ بدنام تمھارا

ناکام ہوں پر طالبِ ناکام تمھارا

میں اس کو نہ بیچوں عوضِ ملکِ سلیماں

ہے ثبت سرِ خاتمِ دل نام تمھارا

یاں ساغرِ دل خونِ تمنّا سے بھرا ہے

پُر بادۂ گلگوں سے وہاں جام تمھارا

محرومیِ قسمت ہے مری خاص وگرنہ

مشہورِ جہاں ہے کرمِ عام تمھارا

چھپتے نہیں نظروں میں مہ و مہر کے جلوے

رہتا ہے تصوّر سحر و شام تمھارا

تم جس سے پھرو، اُس سے ہو برگشتہ زمانہ

دم بھرنے لگی گردشِ ایام تمھارا

جاتی رہی دل سے ہوَسِ سیرِ گلستاں

جب سے نظر آیا رُخِ گلفام تمھارا

غفلت میں کٹی جاتی ہے محروم جوانی

اچھّا نظر آتا نہیں انجام تمھارا

۱۴

مُسکراہٹ ہے کسی کی خندۂ گُل کا جواب

گِریہ اپنا گِریۂ خونینِ بُلبُل کا جواب

ہیں بتوں کی مشکبو زُلفیں تو چہرے لالہ رنگ

ہند کا ہر شہر ہے تاتار و کابُل کا جواب

پنجۂ وحشت سے کچھ کچھ دیدۂ خونبار سے

"دامنِ عاشق بنا ہے دامنِ گُل کا جواب"

سرنگوں خورشید ہے، ماہِ مبیں ہے داغدار

کس سے بن آئے تری شانِ تجمُّل کا جواب

باغِ دُنیا سے اٹھیں گے، دیکھ لینا شاد شاد

ہیں سبک روحی میں ہم بھی نکہتِ گُل کا جواب

شعرِ طالبؔ پر تواے محروم مجھ کو وجد ہے

ہے یہ طالب، طالبِ خوشگوئے آمُل کا جواب

لہ منشی دنانک پرشاد طالب بنارسی

نہاں رہا شاہدِ حقیقی، جمالِ قدرت دکھا دکھا کر
دکھائے ظلمت کے اور طبقے خرد نے پردے اُٹھا اُٹھا کر

سمجھ میں آیا نہ رازِ صنعت ذرا بھی صورت گرِ ازل کا
بنا رہا ہے مٹا مٹا کر، مٹا رہا ہے بنا بنا کر

صنم اگر دیرِ شش جہت میں ذریعۂ یادِ حق نہ ہوتے
تو ذکر پر اُن کے شیخ و زاہد نہ بول اُٹھتے "خدا خدا کر"

عزیز ذلت کو کر دیا ہے، ذلیل عزت کو کر دیا ہے
عدو کو سر پر چڑھا چڑھا کر، نظر سے ہم کو گرا گرا کر

الٰہی اہلِ وطن پہ کب تک رہے گا خوابِ گراں کا عالم
کہ سو گئے بسترِ عدم پر جگانے والے جگا جگا کر

اگر ہے منظور سربلندی، تو دُور نظروں سے کر بلندی
کہ اَوجِ شمس و قمر نے پایا ہے سر کو اپنے جھکا جھکا کر

کمالِ طرزِ ستم ظریفی، مگر وہ کیا دے گا داد اس کی
یہ غیر سے اور ذکر میرا، مجھی کو ظالم! سُنا سُنا کر

جو بُت کو بُت دیکھتا ہو واعظ اُسی کو جا کر سنا یہ باتیں
جنابِ محروم اور ترکِ صنم پرستی، خدا خدا کر

۱۶

جب وہ سہمے شعلۂ آہِ رسا کو دیکھ کر
جل گیا میں اپنی تاثیرِ وفا کو دیکھ کر

یاد ہے اب تک طبیبوں کو وہ حسرت کا سماں
آسماں کو دیکھنا میرا دوا کو دیکھ کر

آرزوئیں اپنے دل کی مل گئیں سب خاک میں
غیر کے کوچے میں تیرے نقشِ پا کو دیکھ کر

دیکھ کر خوابِ زلیخا چونک اُٹھے زُرزانل

"ہو گئے ہم آشنا نا آشنا کو دیکھ کر"

ہم کو یاد آیا کیا گلشن میں وہ سرمستِ ناز
لغزشِ مستانۂ بادِ صبا کو دیکھ کر

کیا ہی بیجا ہے یہ استعمالِ رحمتہائے حق
رُو سیہ کرتے ہیں مے نوشی گھٹا کو دیکھ کر

فکرِ روزی کے لئے بیشک ہے گردش لازمی
ہم کو سوجھا ہے یہ مضموں آسیا کو دیکھ کر

خواب میں بھی رات بھر آہو نظر آتے رہے
شب جو سوئے تیری چشمِ فتنہ زا کو دیکھ کر

ہاں چلا چل! اے دلِ پُر ذوق یہ منزل نہیں
کیوں ہے ششدر تو طلسمِ ماسوا کو دیکھ کر

فکر کی صیقل پہ اے محروم یوں چمکا اُسے
آئینہ پانی ہو طبعِ پُر صفا کو دیکھ کر

۱۷

بوئے کمال تجھ میں اگر ہے وطن کو چھوڑ
کیا قدر نافہ کی جو نہ آئے ختن کو چھوڑ

ہوں بیقرار جب سے چلا ہوں وطن کو چھوڑ
بیتاب عندلیب ہو جیسے چمن کو چھوڑ

اُس رشکِ یاسمن کا نظارا کیا نہیں
اے عندلیب! وصفِ گُل و نسترن کو چھوڑ

کچّی بھی کج سرشتوں کا زیور ہے سر بسر
کس کام کی ہے زُلف اگر دے شکن کو چھوڑ

محروم، تجھ کو یاد نہیں مصرعۂ امیر
"آرام چاہتا ہے تو فکرِ سخن کو چھوڑ"

۳۶

ہم دل جلوں کو اے بُتِ نامہرباں نہ چھیڑ
بھڑکے گا اور شعلۂ سوزِ نہاں، نہ چھیڑ
صیاد اور خزاں کے ستم اس پہ کم نہیں
تو عندلیبِ زار کو اے باغباں نہ چھیڑ
دُنیا میں اے زباں! روشِ صلحِ کُل نہ چھوڑ
جس سے کسی کو رنج ہو ایسا بیاں نہ چھیڑ
ہمدم! کہیں نہ حسرتِ خوابیدہ جاگ اُٹھے
ایّامِ حُسن و عشق کی پھر داستاں نہ چھیڑ
ہے خاتمہ قریب جوانی کی رات کا
محروم پھر فسانۂ زُلفِ بتاں نہ چھیڑ

۱۹

وہ بُتِ شوخ ہوا رام، غلط
دعوائے مُدّعیِ خام غلط

ترکِ عشقِ بُتِ خود کام غلط
ہم پہ واللہ یہ الزام غلط

کوئی تدبیر نہ بیٹھے گی درست
غم نہ ہوگا دلِ ناکام غلط

شُکر اے دل نہ ہوئے شادیِ مرگ
کہہ دیا تھا، کہ ہے پیغام غلط

چشمِ فتّاں کی عنایات ہیں یہ
فتنۂ گردشِ ایّام غلط

بُلبلِ مستِ بہاراں ہیں ہم
اثرِ بادۂ گلفام غلط

ہجر میں رات گذرتی ہی نہیں
توسنِ عمرِ سُبک گام غلط

قیس و فرہاد نے پایا کیا نام
مرد ہو عشق سے بدنام غلط

کس کی حسرت ہے بتا دے ہم کو
ورنہ محروم ترا نام غلط

اب جی میں ہے کہ ہاتھ سے جانے نہ پائے دل
آنے نہ دوں کسی پہ جو قابو میں آئے دل
تُو جس کو دیکھتا ہے، وہ کہتا ہے "ہائے دل"
اک سرسری نظر بھی ہے، صبر آزمائے دل
ظالم ہو، بے تمھارے مگر چین بھی نہیں
آزارِ جاں ہو، پھر بھی ہو لیکن دوائے دل
کس سے سُنوں جو تم نہ کرو بات پیار کی
کس سے کہوں جو تم نہ سنو ماجرائے دل
تکلیفِ سیرِ گُل مجھے اے ہم نشیں نہ دے
پھولوں سے کم نہیں ہیں مرے داغہائے دل
ناصح! علاجِ عشق ہے ہر چند ترکِ عشق
لیکن ہے یہ خیال بھی حسرت فزائے دل
کیا خوب ساز ہے کہ نوا سنجِ راز ہے
محروم دل پذیر ہے، کتنی صدائے دل

خنجر بدست ہے وہ بُتِ شنگ آج کل
چھڑنے کو ہند میں ہے کوئی جنگ آج کل

ممکن ہے مر گیا ہو ترا وحشیٔ حزیں
لڑکوں کے ہاتھ میں جو نہیں سنگ آج کل

کس مستِ ناز کے لبِ لعلیں کو دیکھ کر
پانی ہے شرم سے مئے گُل رنگ آج کل

لیتا ہے نام و ننگ کی مستوں کے سامنے
ناصح جو آبرو سے ہے کچھ تنگ آج کل

اُس گُل کی بُو صبا! نفسِ دوست، اے صبا
غنچے سے بھی زیادہ ہوں دل تنگ آج کل

اُلفت بھی چل رہی ہے زمانے کے ساتھ ساتھ
اگلے سے عاشقی کے نہیں ڈھنگ آج کل

بزمِ سخن کا رنگ ہے پھیکا پڑا ہوا
محروم کیوں خموش ہے نیرنگ[1] آج کل

[1] میر غلام بھیک نیرنگ انبالوی جن کا کلام "مخزن" میں شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ غزل بھی "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔

ادائے ناز سے مستانہ جب وہ چلتے ہیں
قدم قدم پہ گماں ہے، ابھی کھسپلتے ہیں

الٰہی کیسے ہیں میری اُمید کے پودے
نہ پھولتے نظر آتے ہیں یہ نہ کھلتے ہیں

چمکتے پیری میں ہوں گے یہ داغہائے شباب
کہ شام ہوتی ہے جس دم چراغ جلتے ہیں

سفر میں زحمتِ پا سے جو جی چراتے ہیں
وہ بیٹھے دُور ہی منزل سے ہاتھ ملتے ہیں

خیالِ حُسنِ گذشتہ سے کیوں ملول ہو تم
بہاریں ہوتی ہیں آخر شباب ڈھلتے ہیں

دلِ شکستہ شاعر ہے منبعِ مضمون
کہ ٹوٹتی ہے صدف تو گہر نکلتے ہیں

نہیں ہے فنِ سخن، شغلِ بیہدہ محروم
یہی ہے جس سے ہزاروں کے جی بہلتے ہیں

شکوے فضول سب، ستمِ آسماں کے ہیں

پامال ہم تو گردشِ چشمِ بُتاں کے ہیں

خلوت نشیں حرم کے ہیں یا دیر کے مکیں

سب سجدہ کرنے والے اُسی آستاں کے ہیں

ہر ذرّہ اُن کی بزم کا خورشید ہے مجھے

یارب مری نگاہ میں جلوے کہاں کے ہیں

پائیں حضورِ عشق سے یہ سرفرازیاں

نالے بہت بلند جو مجھ ناتواں کے ہیں

شیرینیٔ زباں پہ نہ اہلِ غرض کی جا

دل میں بھرا ہے زہر یہ میٹھے زباں کے ہیں

آراستہ ہیں دل میں تصوّر کی محفلیں

وہ میرِ بزمِ محفلِ رازِ نہاں کے ہیں

گھر میں ہوں یا سفر میں ہوں دشمن ہے آسماں
ہر جا ہیں تیرہ بخت کہ ہندوستاں کے ہیں

محروم آزمائے طبیعت غزل میں کیا؟
یہ فکر کم نہیں ہے کہ دن امتحاں کے ہیں[1]

۲۴

کل ہوا اقرار سو انکار سے ۔۔۔ آج اُنھیں انکار ہے اقرار سے
زہر دیتے ہیں وہ شیرینی کے ساتھ ۔۔۔ غیر بھی خوش ہوں نہ اُن کے پیار سے
مدعا یہ تھا کہ کچھ مغموم ہوں ۔۔۔ کہتے ہیں خوش ہوں ترے اشعار سے
ہم سُبک روحوں کو دُنیا سے غرض ۔۔۔ دامنِ صرصر نہ اُلجھا خار سے
یاد محروم آگیا وہ رشکِ گُل ۔۔۔ داغِ حسرت لے چلے گلزار سے

خوش ہوئے لاہور میں محروم ہم
حضرتِ اقبال کے دیدار سے

[1] ایامِ طالب علمی میں سالانہ امتحان کے دنوں میں کہی گئی (دسمبر ۱۹۰۵ء)

۲۵

قابل ہماری سیر کے باغِ جہاں نہیں
نشو و نمائے نخلِ محبت یہاں نہیں

تسکینِ دل نہیں، کہ وہ تسکینِ دل نہیں
آرامِ جاں نہیں کہ وہ آرامِ جاں نہیں

دل آپ کا ہی سنگ سے ہے سخت ورنہ یاں
سوزِ نہاں نہیں ہے کہ آہ و فغاں نہیں

جن کے کلامِ تلخ میں ہے زہر کا اثر
ہے مارِ سُرخ اُن کے دہن میں زباں نہیں

کیوں پیش و پس ہے آپ کو لینے میں دل مرا
دیتا ہوں اک نگاہ پہ اتنا گراں نہیں

چکی کے دو ہیں پاٹ کہ ہم جن میں پس گئے
محروم یہ زمیں نہیں وہ آسماں نہیں

زوالِ حُسن ساری ہے، گُلوں میں، گلعذاروں میں
نہاں ہے خارِ حسرت کی خلش پھولوں کے ہاروں میں
نشاط افروزیٔ دل بزمِ فانی کے نظاروں میں؟
فروغِ جلوۂ مہتاب ناممکن شراروں میں
نہ چھیڑ اے آرزوئے نغمہ میرے سازِ ہستی کو
کہ پنہاں جُز نوائے غم نہیں کچھ اس کے تاروں میں
شبستانِ فلک میں محوِ خوابِ ناز ہے کوئی
کہ ایمائے خموشی ہے کواکب کے اشاروں میں
یہ احساں مفت کا ہے، حالِ عاشق پوچھتے جاؤ
کہاں ہے تابِ گویائی تمھارے غم کے ماروں میں
پسندِ خاطرِ محروم، طرزِ صاف گوئی ہے!
چھپا سکتا ہوں ورنہ دل کا مطلب استعاروں میں

آ ہی جائیں وہ کلیجا تھام کر، اتنا تو ہو

میری آہوں، میرے نالوں میں اثر اتنا تو ہو

شمع سے کم ہو نہ سوزش میں بشر اتنا تو ہو

سر سے اک شعلہ اُٹھے، سوزِ جگر اتنا تو ہو

سیرِ گلشن کی ہوس اے ہمصفیرو! اب کسے؟

کھول دے کوئی قفس میں بال و پر اتنا تو ہو

آنسوؤں کے تار سے پہنچے خبر دل کی وہاں

مجھ کو تجھ سے فائدہ اے چشمِ تر اتنا تو ہو

حسرتِ پابوس ہے، آنکھوں سے مَل لیں گے اسے

ہم کو مل جائے کسی کی خاکِ در، اتنا تو ہو

میرے کانوں سے سُنے، میری زباں سے کہہ سکے

آشنائے رازِ الفت، نامہ بر اتنا تو ہو

تجھ کو اے محروم، ذوقِ پارسائی ہی سہی

بُت پرستی میں جوانی ہو بسر، اتنا تو ہو

۲۹

لاکھوں ہیں دل رُبا، کوئی دلدار بھی تو ہو
غم دے چکے بہت، کوئی غم خوار بھی تو ہو

فریاد میں تو میں، مرے زخمِ جگر کریں
اُس بزم میں اجازتِ گفتار بھی تو ہو

قسمیں نہ بار بار دلائیں تو کیا کریں
اقرار سا کوئی ترا اقرار بھی تو ہو

افسوس ہے کہ ساتھ تمھارے نہ میں رہوں
موجود گُل جہاں ہے وہاں خار بھی تو ہو

محروم لاجواب ہے یہ مصرعۂ امیر
"عیسیٰ ہیں سینکڑوں، کوئی بیمار بھی تو ہو"

۳۰

سمجھ کر رہیں دِفا ہر کسی کو
ستمگر! نہ اتنا ستا ہر کسی کو

بُتِ بے وفا! تجھ کو معلوم بھی ہے
کہ ہونا ہے پیشِ خدا ہر کسی کو

نہ بُھولے کوئی بے بقا زندگی پر
کہ لینی ہے راہِ فنا ہر کسی کو

کسی کو ہے اپنا کسی کو پرایا
کیا دل نے دردِ آشنا ہر کسی کو

وہ کرتے ہیں مُردوں کو ٹھوکر سے زندہ
"یہ سُن سُن کے مرنا پڑا ہر کسی کو"

کرم پر نہ ہو نازاں اہلِ کرم کو
کہ ہے دینے والا خدا ہر کسی کو

مرے حق میں ہونے لگا قہر ظالم
ترا پیار سے دیکھنا ہر کسی کو

بلا تیری زلفِ معنبر کو کہہ کر
ڈراتے ہیں اے مہ لقا ہر کسی کو

کبھی اپنے شیداؤں کا امتحاں کر
نہ پائے گا محرم سا ہر کسی کو

۳۱

رُخِ انور پہ بکھرتے ہیں معنبر گیسو
دل کو کرتے ہیں پریشان ستمگر گیسو
کبھی آتے نہ قریب رُخِ دلبر گیسو
تیرہ بختی میں جو ہوتے مرے ہمسر گیسو
تُل کے آئی ہے گھٹا ملک حبش پر گویا
تِل پہ رخسار کے ہیں جمع جو یکسر گیسو
مصحفِ رُخ کو پڑے شام و سحر چومتے ہیں
کس سیہ کار کے کہنے سے ہیں کافر گیسو
کیسے بادل ہیں کہ خورشید سے بھی اونچے ہیں
نیچے نیچے ہے جبیں اور ہیں اوپر گیسو
دیکھتے دیکھتے ہی دل کو اُڑا لیتے ہیں
دیکھنے کو تو نظر آتے ہیں بے پر گیسو

مل رہا زنگی سے زنگی ہے فرنگستاں میں

خالِ رخسار پہ ٹھہرا ہے جو آ کر گیسو

آبِ کوثر سے ہے فردوس میں شبنل شادا ب

قطرہ ہائے عرق رُخ سے جو ہیں تر گیسو

نہ سخن میں انھیں ہم باندھ بٹھاتے محروم

یوں اُٹھاتے نہ اگر فتنۂ محشر گیسو

۳۲

کسی کی جستجو ہے اور میں ہوں
وہی اک آرزو ہے اور میں ہوں

تصور ہے کسی کا اور دل ہے
وہ صورت رُوبرو ہے اور میں ہوں

میں اپنے پنجۂ وحشت کے صدقے
سدا شغلِ رفو ہے اور میں ہوں

نہیں کھلتا ہے رازِ ہستیٔ گل
طلسمِ رنگ و بو ہے اور میں ہوں

بدلتا ہے زمانہ پر یہاں تو
وہی بیگانہ خو ہے اور میں ہوں

کیا اے عشق تو نے خوب رسوا
کہ چرچا کو بکو ہے اور میں ہوں

وہی دل ہے، وہی فرقت کا رونا
وہی محروم تو ہے اور میں ہوں

جو یُونہی رہے گا مرے جگر سے تری نظر کا معاملہ
تو سمجھ لے بس کوئی دن ہے اور مرے جگر کا معاملہ

بچُوں تیری آتشِ عشق سے، یہ مجال و تاب کہاں مجھے
مرے دل کا اور ترے حُسن کا ہے خس و شرر کا معاملہ

کوئی ایسا شہر بسائے عشق، نہ کچھ ہو جس میں سوائے عشق
نہ ہو نام و ننگ کا مخمصہ، نہ ہو سیم و زر کا معاملہ

یہ انوکھی چھیڑ ہے زاہدا! تجھے مجھ سے کیا، مجھے تجھ سے کیا
ترے زُہدِ خشک سے ہے جُدا، مری چشمِ تر کا معاملہ

تھے کھُلے ہوئے مرے بال و پَر، ہیں قفس سے اُڑ نہ سکا مگر!
یہ ہے دل کے ذوق پہ منحصر، نہیں بال و پر کا معاملہ

یہ نظر نظر کا مقابلہ ہے پیامِ غارتِ دل تلک
کہ ضرور پہنچے گا شہر تک سرِ رہ گذر کا معاملہ

ٔ شاعر کے نام کی تخفیف

گرے ہم لڑکھڑا کر پائے ساقی پر جو مستانہ

کہا پیرِ مغاں نے ہے یہ مستی میں بھی فرزانہ

کمالِ عشق میں ممکن نہیں وہمِ رقابت ہو

لڑا کب شمع پر جلنے میں پروانے سے پروانہ

مجھے کیا ہے جو میں شیخ و برہمن کی طرح بھٹکوں

بنا لیتا ہوں دل کو گاہ کعبہ گاہ بت خانہ

ہماری مے پرستی کی خبر ہے چشمِ ساقی کو

نہ ساغر کی ضرورت ہے، نہ ہے درکار پیمانہ

گیا ہے چھوڑ کر وہ حورِ روش نقشِ قدم اپنے

انھیں پھولوں سے ہے گلزارِ جنّت اپنا کاشانہ

محبّت اور جنوں میں قُرب ہے اور بُعد بھی کتنا

کہاں لیلیٰ کا کوچہ اور کہاں مجنوں کا ویرانہ

تو ہے اُس ماہ کا طالب، نہ پہنچا کوئی بھی جس تک

جواں ہو کر بھی ضِد تیری رہی محرومِ طفلانہ

آئی کیا تم پہ طبیعت کہ مصیبت آئی !
چین پایا نہ کبھی جب سے طبیعت آئی

شامِ ہجراں میں وہی زلف کی ظلمت آئی
دلِ مجبور! مصیبت پہ مصیبت آئی

دستِ قسّامِ ازل چوم، تری قسمت میں
کچھ بھی گر چاشنیٔ دردِ محبّت آئی

اک بلا آنکھیں دکھاتی ہوئی آئی دیکھو
بیکسو! تاروں بھری کیا شبِ فرقت آئی

رات پروانوں کو جب شمع پہ جلتے دیکھا
اپنی محرومی پہ پہروں مجھے حسرت آئی

داغِ فرقت نے دکھائی خورِ محشر کی تپش
آئی کیا شامِ الم، صبحِ قیامت آئی

تشنہ لب محفلِ ساقی سے اُٹھا میں محروم
دورِ ساغر کی نہ مجھ تک کبھی نوبت آئی

مہرباں تھے وہ مگر بے سود غمخواری رہی
دل رہا پہلو میں جب تک دل کی بیماری رہی

کس کو فرصت تھی، خیالِ لذّتِ دیدار کی
سامنے جب تک رہے وہ بیخودی طاری رہی

ہم وہی ہیں اور طوفِ کوئے جاناں ہے وہی
لاکھ رسوائی رہی، ذلّت رہی خواری رہی

شاملِ تعمیرِ دنیا تھی یہی بے رَونقی
عشق کے دم سے، مگر کچھ گرم بازاری رہی

کثرتِ غم نے مٹا دی، کاوشِ احساسِ غم
ہمنشیں! اب ہم سے مشقِ گریہ وزاری رہی

خودنمائی سے رہا پرہیز ہم کو عمر بھر
خود فراموشی اب آئی، پہلے خودداری رہی

المدد اے دردِ دل! آنکھوں کے چشمے خشک ہیں
وہ بھی دن تھے جب یہیں سے نہر سی جاری رہی

فیضِ قاتل نے دکھائی ہم کو بھی کیا کیا بہار
پھول زخموں کے رہے، داغوں کی گلکاری رہی

ہجر کی شب اور تو کوئی نہ تھا پُرسانِ حال
شاملِ سوز و گداز، اک شمع بیچاری رہی

تیرے چشم و رُخ نے پرتو جب سے ڈالا باغ پر
چاک داماں گُل رہا، نرگس کو بیداری رہی

کر دیا یاسِ دوامی نے، ہر اک سے بے نیاز
اب کہاں محرومؔ، تابِ ناز برداری رہی

۳۷

کچھ نئے داغ، کچھ پُرانے ہیں — آج اُن کو سبھی دکھانے ہیں
پُر ہے نوحوں سے زیست کا دیواں — ناسخنداں کو یہ ترانے ہیں
کوہ و صحرا و ساحلِ دریا — بے ٹھکانوں کے سو ٹھکانے ہیں
عمرِ انساں ہے ایک لحظہ، مگر — اس میں کیا مختلف زمانے ہیں
بولے ذکرِ وفائے لیلےٰ پر — یہ حکایات ہیں، فسانے ہیں
لے چلا دل کسی کی محفل میں — موت آنے کے یہ بہانے ہیں

ہم بھی ایسے نئے نہیں محرومؔ
یہ مضامیں اگر پُرانے ہیں

سیہ بختی پہ رہتی ہے نظر اہلِ بصیرت کی
اِسی سُرمے سے بینائی ہے قائم چشمِ عبرت کی
فلک خود مبتلائے گردشِ ایّام پھرتا ہے
ہے ناداں جو رکھے اس سے تمنّا عیش وعشرت کی
بہارِ باغِ امکاں ہے، سُبک رَوحوں کی محنت سے
سواری آتی ہے دوش ہوا پر ابرِ رحمت کی
نظر کر خندۂ گُل پر ریاضِ دھر میں غافل
نہایت مختصر ہے، جو گھڑی ہے یاں مسرّت کی
دُعائے سینہ ریشاں رائیگاں ہرگز نہیں جاتی
زمیں سے تا فلک وسعت ہے دامانِ اجابت کی
بیاباں گرد مجنوں، کوہ کن کاٹے پہاڑوں ہیں
کٹھن اے بوالہوس! ہیں منزلیں راہِ محبّت کی
دلِ حیراں سے حیرانی نہ نکلی ہے نہ نکلے گی!
میں انساں ہوں الٰہی، یا ہوں پُتلی چشمِ حیرت کی

گردش نہ کام آئی ذرا سال و ماہ کی
حالت وہی رہی مرے حالِ تباہ کی

وحشت ہے مجھ کو یاد میں زلفِ سیاہ کی
زنجیر بھی ہو سلسلۂ دود آہ کی

آخر ہیں یہ بھی تو اُسی صانع کی صنعتیں
قلعی نہ آپ کھو لیئے خورشید و ماہ کی

دیں گے بھلا وہ اپنے کیئے کی سزا کسے
فریاد کیا سُنیں وہ کسی دادخواہ کی

میرا قصور کیا، جو کھنچوں آپ کی طرف
تم مثلِ کہربا، مری صورت ہے کاہ کی

مجھ کو یہ رشک ہے کہ مجھے بھی خبر نہ ہو
اچھّی کہی یہ وعدے پہ تم نے گواہ کی

مطلب غزل سے ہے مجھے اظہارِ مُدعا
محروم آرزو، نہیں کچھ آہ و واہ کی

مانگتے ہی رہ گئے بیکس دُعا برسات کی
آسماں! تُونے نہ دکھلائی گھٹا برسات کی

خشک گذرا اب کے ساون بھی، بہت حیران ہیں
ہو گئی تبدیل یارب فصل کیا برسات کی

آسماں پر ایک بھی بدلی نظر آتی نہیں
ہے نظر بدلی ہوئی وا حسرتا برسات کی

مانگتا ہوں میں دعائے ابر رو رو کر ابھی
آرزو تجھ کو اگر ہے ساقیا برسات کی

پھول مرجھائے ہوئے ہیں، غنچے کملائے ہوئے
حال پر اُن کے کرم کر، اے ہوا برسات کی

زرد ہے دھانوں کی رنگت خشک دہقانوں کے لب
بھیج دے کالی گھٹا، اب اے خدا برسات کی

انتظارِ ابر میں محروم بھی ہے بے قرار
اپنی رحمت سے دکھا اس کو فضا برسات کی

۱۴

لے کے آئی مژدۂ رحمت ہوا برسات کی
دل بڑھا، جوں جوں بڑھی سر پر گھٹا برسات کی

آبشاروں سے نکلتی ہے صدائے مرحبا
اور جھرنوں کے ترنّم سے نوا برسات کی

گل بداماں ایک چھینٹے سے ہوئے سب کوہ ودشت
موسمِ گل سے بھی رونق ہے سوا برسات کی

سبزۂ افسردہ، نخلِ مُردہ میں جان آگئی
فی الحقیقت ہے دمِ عیسیٰ ہوا برسات کی

سبزہ و گُل، مور و ماہی، مردُم و وحش و طیور
پرورش برسات کرتی ہے برابر سات کی

صبحدم ہوتی ہے کیا کیا باعثِ تسکینِ روح
کونسے طبقے سے آتی ہے ہوا برسات کی

لوٹتا ہوں میں تصوّر میں مزے برسات کے
ورنہ دیکھی کس نے ڈیرےؔ میں فضا برسات کی

فرصتِ فکرِ سخن محرومؔ کو کب ہے، مگر
بھا گئی دل کو ردیفِ خوشنما برسات کی

ؔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں (شمالی مغربی سرحدی صوبہ)

۹۳

وہ برقِ نظر دل کو تڑپا گئی[1] | مجھے جلوۂ طُور دکھلا گئی
ہوا جب سے آزارِ اُلفت پدید | مسیحائی تیری مسیحا گئی
کسے چھو کے آئی تھی بادِ نسیم | کہ بیگانہ وش مجھ سے کترا گئی
صبا! قیس کی بات کا بھی جواب | کدھر نکہتِ زُلفِ لیلےٰ گئی
جدھر آنکھ اُٹھائی ہوئے دل خراب | نظر کیا گئی، موجِ صہبا گئی
پلایا محبّت نے زہرابِ غم | جوانی ہماری ہمیں کھا گئی
گیا دل سے اب خوفِ روزِ جزا | قیامت تری چال میں آ گئی
ابھی آنکھ نرگس نے کھولی نہ تھی | "خدا جانے کس کی نظر کھا گئی"

نہ محروم کو چھیڑنا ناصحا!
طبیعت اگر آ گئی، آ گئی

[1] دفتر "صدائے ہند" لاہور کا طرحی مشاعرہ (دسمبر ۱۹۰۷ء)

کم نہ تھی صحرا سے کچھ بھی خانہ ویرانی مری
میں نکل آیا کہاں لے وائے نادانی مری
کیا بناؤں میں کسی کو رہبرِ ملکِ عدم!
اے خضر! یہ سرزمیں ہے جانی پہچانی مری
جان و دل پر جتنے صدمے ہیں اسی کے دم سے ہیں
زندگی ہے فی الحقیقت دشمنِ جانی مری
ابتدائے عشقِ گیسو میں نہ تھیں یہ الجھنیں
بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی آخر پریشانی مری
دشتِ ہستی میں وہاں ہوں مُدّعا کچھ بھی نہیں
کب ہوئی محتاجِ لیلے اقیس سامانی مری
اور تو واقف نہیں کوئی دیارِ عشق میں
ہے جنوں شیدا مرا، وحشت ہے دیوانی مری
باغِ دنیا میں یونہی رہ ہنس کے کاٹوں چار دن
زندگی ہے شبنم و گل کی طرح فانی مری

بعدِ ترکِ آرزو بیٹھا ہوں کیسا مطمئن
ہو گئی آساں ہر اک مشکل بآسانی مری

ہاں! خدا لگتی ذرا کہہ دے تُو اے حسنِ صنم
عاشقی اوروں کی اچھی، یا کہ حیرانی مری

لختِ دل کھانے کو ہے، خونِ جگر پینے کو ہے
میزبانِ دہر نے کی، خوب مہمانی مری

نغمہ زن صحرا میں ہو، جس طرح کوئی عندلیب
یوں ہے اے محروم سرحد[1] میں غزلخوانی مری

[1] شمال مغربی سرحدی صوبہ

رہی فراق میں بھی شکل رُو برُو تیری!
شبیہہ کھینچی تصوّر نے ہُو بہُو تیری

معاف رکھ، جو ہے گُلہائے تر سے پیار مجھے
کہ اِن میں رنگ ترا کچھ ہے، کچھ ہے بُو تیری

نسیمِ صبح کا جھونکا نفس نفس تیرا
رہے گی سوختہ جانوں کو آرزو تیری

یہ فخر کم ہے کہ ہم قابلِ خطاب تو ہیں
عزیز اَور کے اَلقاب سے ہے "تُو" تیری

دہانِ غنچۂ تر سے، زبانِ سوسن سے
چمن چمن میں سُنی ہیں نے گفتگو تیری

دل و جگر پھُکے جاتے ہیں سوزِ ہجراں سے
لگن عذاب ہوئی مجھ کو شمع رُو تیری

کہاں کہاں ترے محروم کو بقول سرورؔ[1]
"کشاں کشاں لئے پھرتی ہے جستجو تیری"

[1] منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی

۴۵

جب وہ صورت نظر نہیں آتی — کب مری آنکھ بھر نہیں آتی

کوئے دلدار سے نسیم سحر — آتی ہے جب اِدھر نہیں آتی

کیا ہوا سوزِ غم کہ اشکوں سے — بوئے داغِ جگر نہیں آتی

حور سے کیا لگے گا دل واعظ — یاں طبیعت اگر نہیں آتی

موت کو بھی خبر نہیں شاید — کہ وہاں سے خبر نہیں آتی

زندگی یا تو ہے وبال کوئی — یا مجھی کو یہ کر نہیں آتی

شب ہجراں وہ شب ہے جس کے بعد — تا قیامت سحر نہیں آتی

شب فرقت کی داستاں ہے طویل — نیند المختصر نہیں آتی

ہے طبیعت تری رسا محروم
تجھ کو اُردو مگر نہیں آتی

۴۶

تیرا رُخِ روشن صنما! دیکھنے والے

ہیں جلوۂ انوارِ خدا، دیکھنے والے

کیا دیکھتا ہے خال و خط و چشمِ حسیناں

کھول اور بھی آنکھوں کو ذرا، دیکھنے والے

موسیٰ نے جو دیکھا تھا کبھی طور پہ جلوہ

نت دیکھتے ہیں تیری ادا دیکھنے والے

عاشق نہ سہی، اس میں کسے شک ہے کہ ہم ہیں

کر کر کے وفا، جور و جفا، دیکھنے والے

دل اُن کا چمن میں نہ لگا ہے نہ لگے گا

جو ہیں ترے کوچے کی فضا دیکھنے والے

ظالم ترا کیا حال ہو اِس ظُلم کے بدلے
دیکھیں گے اِسے روزِ جزا دیکھنے والے

بُھولے سے بھی ہم عشق کسی کا نہ کریں گے
یوں کہتے ہیں انجام مرا دیکھنے والے

تیغِ نظرِ یار کے کِھچنے کی کسر ہے
چکّھیں گے مزا دیکھنے کا دیکھنے والے

بیگانگی ٹپکے ہے نگاہوں سے تری کیوں
میں ہُوں وہی محروم ترا، دیکھنے والے

۴۷

آہِ شرر آمیز میں کیوں کر اثر آئے

جلتے ہوئے پودے میں کہاں سے ثمر آئے

غافل! تجھے یاں دیکھنا کچھ بھی اگر آئے

ہر ذرّے میں خورشید کا جلوہ نظر آئے

دی کیسے نزاکت نے اجازت یہ سفر کی

"تم آنکھوں سے دل میں مرے کیوں کر اتر آئے"

پھر لذتِ ایذا کی ہوئی دل کو تمنّا

اللہ کرے وہ بُتِ بیداد گر آئے

محفل میں تری شمع بھی روتی ہوئی آئی

اک ہم ہی نہ اس بزم میں با چشمِ تر آئے

ق

اے منعمو! جاؤ گے تہیدست جہاں سے
جس طرح کہ اِس دہر میں بےسیم و زر آئے

دے جاؤ یہیں تم نے لیا ہے جو یہاں سے
قاروں کی حکایات سے عبرت اگر آئے

دھس جاؤ نہ حسرت سے زمیں میں دمِ رحلت
اور بارِ چہل گنج نہ بالائے سر آئے

محروم تصنّع کی ضرورت نہیں مجھ کو
میری یہ تمنّا ہے غزل میں اثر آئے

۴۸

عہد میں ابتری نہ ہو جائے
بات پھر سرسری نہ ہو جائے

اللہ اللہ فروغِ طلعتِ حسن
مہر کیوں مشتری نہ ہو جائے

دیکھ کر بُت کو لے خدا کا نام
عاشقی کافری نہ ہو جائے

اُلفتِ خال سے مجھے حاصل
سوختہ اختری نہ ہو جائے

یوں بھی نفرت نہ آدمی سے ہو
یوں بھی انساں پری نہ ہو جائے

آتشِ عشق سے اسے پگھلا
دل ترا کشکری نہ ہو جائے

وہ نگاہیں کچھ اور کہتی ہیں
دلدہی دلبری نہ ہو جائے

چشمِ تر کو سنبھالنا محروم!
شاخِ غم پھر ہری نہ ہو جائے

۵۰۵

۴۹

نہ پھر جہاں میں بلندیٔ عزّ و شاں کے لئے
یہ کام چھوڑ سیہ بخت آسماں کے لئے

مری فغاں ہی سے رونق ہے میری ہستی کی
صدا جرس کی ضروری ہے کارواں کے لئے

خلش نے دل کو مرے کچھ مزا دیا ایسا
کہ جمع کرتا ہوں میں خار آشیاں کے لئے

کیا ہے وار تو کام اب کام تمام کرتا جا
نہ چھوڑ مجھ کو ستم ہائے آسماں کے لئے

نہیں ہے شکوۂ خوبانِ آتشیں رخسار
ازل سے وقف ہے دل سوزشِ نہاں کے لئے

خدا کرے یہ سمجھ لے مآلِ عشقِ بتاں!
دعا کرو کوئی محرومِ خستہ جاں کے لئے

یہ شفق کے رنگ جو دیکھتا ہے تو صبح و شام نئے نئے

ہیں کسی کے خوں نے کھلائے گُل بُتِ لالہ فام نئے نئے

نہیں اب فغاں میں بھی کچھ مزا، کہ نشیمن اپنا قفس ہوا

وہ زمانہ خوب تھا جب کہ ہم تھے اسیرِ دام نئے نئے

ہوا ہم کو تجربہ پے بہ پے، کہ مآلِ وعدہ جو ہے سو ہے

کئے جائیں عہد پہ عہد آپ برائے نام نئے نئے

غمِ تازہ ہے دلِ مردہ کا، اَلَم آرزوئے فسردہ کا

تری بزمِ ناز میں دیکھ دیکھ کے اہتمام نئے نئے

دلِ زار محوِ جمال ہو، تو ابھی سبیلِ وصال ہو

چلے آئیں محفلِ دل رُبا سے تجھے پیام نئے نئے

کبھی عرش سے بھی پرے گئے، کبھی فرش ہی پہ دھرے رہے

نظر آئے منزلِ عشق میں ہمیں نت مقام نئے نئے

جو مزا زلالِ سخن میں ہے، وہ کہاں شرابِ کہن میں ہے

تلک[1] آج ساقیِ غیب نے دیئے بھر کے جام نئے نئے

[1] نام کا مخفف

جب ترا جلوۂ رُخسار نظر آتا ہے
مُجھ کو اک عالمِ انوار نظر آتا ہے

نظر آتا نہیں جس روز وہ رشکِ خورشید
دن مجھے مثلِ شبِ تار نظر آتا ہے

خواب میں بھی تو نہیں چین میسّر ہم کو
کہ وہی فتنۂ بیدار نظر آتا ہے

حشر میں میری طرف جُھک کے کہا رحمت نے
مُجھ کو یہ شخص گُنہ گار نظر آتا ہے

اِس کی تدبیر بھی اے شیشہ گرو! ہے کہ نہیں
دل کے آئینے میں زنگار نظر آتا ہے

نظر آتے تھے کبھی خار میں جلوے گُل کے
پھول بھی اب تو مجھے خار نظر آتا ہے

نوجوانی میں ترے رُخ پہ یہ زردی محروم
ہو نہ ہو عشق کا آزار نظر آتا ہے

۵۲

اُن کے بغیر آئے گی ہرگز نہ کل مجھے
اے شوق! وہ جہاں ہوں وہیں لے کے چل مجھے

مایوس بارہا میں گیا زیرِ بام سے
شکوہ نہیں ہے آپ سے کچھ بے محل مجھے

کہتے ہیں میرے کوچے میں رکھنا نہ پھر قدم
جانا پڑے گا اب تو وہاں سر کے بَل مجھے

واعظ! اسی لئے تو حسینوں سے کام ہے
معلوم ہے فضیلتِ حُسنِ عمل مجھے

اُن کی ہر ایک بات ہے حنظل سے تلخ تر
اچھا ملا یہ نخلِ محبت سے پھل مجھے

شاید ابھی شباب کے باقی ہیں ولولے
محروم آج تک جو ہے ذوقِ غزل مجھے

۵۳

پھر یاد میرے دل میں کسی بے وفا کی ہے
پھر جانِ مبتلا کو تمنّا جفا کی ہے

پھر میں ہوں اور جوشِ محبّت کے ولولے
پھر دل ہے اور یاد کسی دل رُبا کی ہے

جلوے دکھا رہا ہے تصوّر مجھے، کہ پھر
تصویر رُوبرُو مرے اک مہ لقا کی ہے

پھر ابتدائے شعلہ فشانیِٔ شوق ہے!
پھر خاطرِ حزیں میں تپش انتہا کی ہے

پھر ہم خدا کو بھول کے یادِ صنم میں ہوں
محروم کیا کروں، یہی مرضی خدا کی ہے

۵۴

ابرِ تر گریاں ہے تو اک فصل، اک موسم میں ہے
یہ کہاں شامل ہمارے گریۂ پیہم میں ہے

مرتی رہتی ہے سدا پہلو میں حسرت اک نہ اک
شاد کیا ہو دل کہ دائم حلقۂ ماتم میں ہے

حسرت افزا داستانِ آدم و حوّا ہے کیا
آہ! فُرقت ابتدا سے قسمتِ آدم میں ہے

کاٹتا ہوں زندگی اُمّیدِ بعدِ مرگ پر
پرتوِ صبحِ مسرّت، میری شامِ غم میں ہے

میری چشمِ شوق کو کیفیّتِ نظّارہ دے
دیکھوں ہر ذرّے میں جو کچھ ذکرِ جامِ جم میں ہے

نامرادِ دہر ہیں ہنگامہ کوشانِ جہاں
جز خس و خاشاک کیا دامانِ موجِ یم میں ہے

آکے کردے گی برابر موت اک دن دخل و خرج

کیوں اسیرِ حرصِ دنیا فکرِ بیش و کم میں ہے

صبحِ پیری ہے تری اور سر پہ ہے وقتِ رحیل

تو ابھی اُلجھا خیالِ گیسوئے برہم میں ہے

قربِ ذاتِ پاک سے انساں نہ کیوں کر پاک ہو

ذرہ روشن تر شعاعِ نیّرِ اعظم میں ہے

ہم نے یاراں ماہرویوں نے ڈبویا دھرکو؟

دیدے جن کی تلاطم، دیدۂ پُرنم میں ہے

یادِ حق میں ذکرِ بُت اور ذکرِ بُت میں یادِ حق

کچھ نہیں کھلتا، کہ یہ محروم کس عالم میں ہے؟

۵۵

طائرِ دل کے لئے زُلف کا جال اچھا ہے

حیلہ سازی کے لئے دانۂ خال اچھا ہے

دل کے طالب نظر آتے ہیں حسیں ہر جانب

اس کے لاکھوں ہیں خریدار کہ مال اچھا ہے

تابِ نظّارہ نہیں گو مجھے خود بھی لیکن!

رشک کہتا ہے کہ ایسا ہی جمال اچھا ہے

دل میں کہتے ہیں کہ اے کاش! نہ آئے ہوتے

اُن کے آنے سے جو بیمار کا حال اچھا ہے

مطمئن بیٹھ نہ اے راہروِ راہِ عروج

ترا رہبر ہے اگر خوفِ زوال اچھا ہے

نہ رہی بیخودیٔ شوق میں اتنی بھی خبر!

ہجر اچھا ہے کہ محرومِ وصال اچھا ہے

وہ ادا جو دشمنِ صبر و قرار و ہوش ہے
دل اُسی پر ہے فدا، کتنا اذیّت کوش ہے

گفتگو ہے باعثِ نااتّفاقی ہائے خلق
مجتمع ہیں لب بہم، جب تک زباں خاموش ہے

دم ہوا گلشن میں اپنا رشک سے کیوں کر نہ ہو
وہ گُلِ خنداں نسیمِ صبح سے ہمدوش ہے

باعثِ شرمندگی ہوگی حیاتِ جاوداں
ورنہ لوگوں سے خضر کس واسطے رُوپوش ہے

مجھ کو آتی ہے ہنسی چرخِ کہن کو دیکھ کر
ظالم اِس پیری پہ چہرہ ماہ در آغوش ہے

مے کدے پر واعظو چھائی ہے رحمت کی گھٹا
مے کشوں کے جمگھٹے ہیں شورِ نوشا نوش ہے

اے بتو! مخمور دم ہے سرمستِ صہبائے ازل
یہ نہ شاہد باز ہے، نے رندِ ساغر نوش ہے

دیکھئے دل میں کسی کی آرزو کب تک رہے؟
اور وہ بیگانۂ خو بیگانہ خو کب تک رہے؟

شوخیوں سے جب وہ قائم اک جگہ رہتے نہیں
پھر تصوّر آہ! اُن کا رُو برُو کب تک رہے؟

مُنہ میں بھر لاتا ہے پانی شیخ! نامِ حُورِ پر
دیکھنا یہ ہے کہ اب تیرا وضُو کب تک رہے؟

بھیجتے ہیں آج مرگِ ناگہانی کو پیام
تیرے وعدوں پر کوئی اے حیلہ جُو کب تک رہے؟

فرصتِ اظہارِ اُلفت دیں تو اے دل کچھ کہوں
دیکھئے یہ ابتدائی گفتگو کب تک رہے؟

بُلبُلِ شیدا! بہت دلکش ہے بیشک حُسنِ گُل
آہ! لیکن اختلاطِ رنگ و بُو کب تک رہے؟

چھیڑتے ہیں خوبرویوں کو سُنا ہے آپ بھی
دیکھئے محروم صاحب! آبرُو کب تک رہے؟

تجھے کبھی تو بُتِ گُلعذار دیکھیں گے
اگر خدا نے دکھائی بہار دیکھیں گے

بہار میں وہ نئی اک بہار دیکھیں گے
گلے میں تیرے جو پھولوں کے ہار دیکھیں گے

سحر کے آنے کا وعدہ تو کر گئے، لیکن!
مریضِ ہجر کا آکر مزار دیکھیں گے

کرے گا موسمِ گُل ہم کو وقفِ داغِ جنوں
بہار دیکھنے والے بہار دیکھیں گے

جنابِ شیخ! چلو سیرِ دیر کر آئیں
بتوں میں صنعتِ پروردگار دیکھیں گے

نہیں ہیں منتظرِ موسمِ بہار اے موت
ہم اپنے پھولوں میں رنگِ بہار دیکھیں گے

ہمارے غنچۂ دل پر پڑی نہیں وہ اوس
کہ اس پہ کچھ اثرِ نوبہار دیکھیں گے

یہی نظر ہے کہ ہم سے ابھی ہے بیگانہ
ابھی ہم اِس کو کلیجے کے پار دیکھیں گے

ہمارے پہلو سے جس روز تو جدا ہو گا
قرار ہم بھی دلِ بے قرار دیکھیں گے

شبِ خزاں سی ہے بے لطف زندگی اپنی
کبھی تو جلوۂ صبحِ بہار دیکھیں گے

اِسی اُمّید پہ جیتے ہیں طالبِ دیدار
کہ جیتے ہیں تو کبھی روئے یار دیکھیں گے

دِکھا رہا ہے تصوّر جو دُور سے ہم کو
وہ دن بھی ہم کبھی محرمِ زار دیکھیں گے

سپوت تیرے تجھے مادرِ وطن کب تک؟
خراب و خستہ و زار و نزار دیکھیں گے

کبھی وہ دَور بھی آئے گا جبکہ بھارت کو
جہاں کے لوگ بچشمِ وقار[1] دیکھیں گے

[1] خدا کا شکر ہے کہ وہ دَور شاعر کی زندگی میں آ گیا

۵۹

دشتِ وحشت میں جو ہم سلسلہ جُنباں ہوں گے
حضرتِ قیس غبارِ سرِ داماں ہوں گے

دامنِ عمر بھی پھٹ جائے گا جب تک کہ رفو
چاکِ دل، چاکِ جگر، چاکِ گریباں ہوں گے

طرفہ تر ہو گی قیامت میں قیامت برپا
آپ جب عرصۂ محشر میں خراماں ہوں گے

روزِ محشر بھی غبار اُن کا بکھر جائے گا
تیرے دلدادہ جو اے زُلفِ پریشاں ہوں گے

یہ ستم دیکھو کہ گھر سے بھی نہ نکلے وہ شوخ
ہم جو کہہ دیں کہ فدائے رہِ جاناں ہوں گے

پھر بہار آئی ہے محروم بقولِ مومنؔ
"وہی ہم ہوں گے، وہی خارِ مغیلاں ہوں گے"

متاعِ صبر و سکوں سب لُٹا کے چلے

کہ ہم اشارے پہ اُس چشمِ فتنہ زا کے چلے

ہیں خُوش ہوا دمِ رخصت جو مُسکرا کے چلے

خبر نہ تھی کہ وہ برقِ ستم گرا کے چلے

ہنسی خوشی وہ یہاں آئے، پر رُلا کے چلے

کہ جاتے جاتے نہ آنے کی پھر سُنا کے چلے

بقائے نام کا جھگڑا یہیں چُکا کے چلے

کہ نقشِ باطلِ ہستی کو ہم مٹا کے چلے

جو سر پہ تاجِ سکندر بھی ہو تو دنیا میں

بشر کو چاہیئے ہرگز نہ سر اُٹھا کے چلے

مسافرانِ عدم ہم سے رُوٹھ ہی بیٹھے

خفا نہ تھے دمِ رخصت تو مِل ملا کے چلے

عزائے گُل سے ہوئی عندلیب کب فارغ

چمن میں جھونکے نہ کب صرصرِ فنا کے چلے

فضائے باغِ جناں میں نہ پائیں گے تسکیں
ہوائے کوچۂ جاناں یہاں جو کھا کے چلے

تمھیں سے لی ہے صبا نے بھی شوخیِ رفتار
چراغِ گورِ غریباں نہ کیوں بُجھا کے چلے

رہے گی حاجت شرحِ جفا نہ محشر میں
اِسی ادا سے جو تم سامنے خُدا کے چلے

شریکِ حال ہوئی شمع، کُشتنی ٹھہری
تمھاری بزم سے ہم دادِ گریہ پا کے چلے

بساط کیا تری میدانِ شعر میں محرُوم
ہزاروں زورِ طبیعت یہاں دکھا کے چلے

لئے چرخِ ستمگر نے یہ کن ایّام کے بدلے
دئے زخمِ جگر مجھ کو بُتِ گلفام کے بدلے

عدم سے آنے والوں کو کوئی اِتنا بتا دیتا
کہ ملتی ہیں یہاں بے چینیاں آرام کے بدلے

شبِ ہجراں کی صورت دن ڈھلے سے پھر نظر آئی
الٰہی! بھیج دے صبحِ قیامت شام کے بدلے

تکلّف برطرف ساقی! ترے میکش کو ہے کافی
تصوّر تیری آنکھوں کا سُرورِ جام کے بدلے

گرفتارِ ازل کو قید اے صیّاد کیا کرنا
پئے بُلبل شمیمِ گُل ہے پیچاں دام کے بدلے

عبادت سے مری بدظن نہ ہوائے بُت! خدا سے بھی
تجھی کو چاہتا ہوں خوبیِ انجام کے بدلے

لکھا اُس شوخ نے محروم کو مرحوم جیتے جی!
حُروف اے وائے بیدردی سے میرے نام کے بدلے

۶۲

ملنے کا جب مزا ہے کہ دل آپ کا ملے

ظاہر میں آپ مجھ سے ملے بھی تو کیا ملے

یہ آرزو ہے اب، نہ رہے کوئی آرزو

یہ مُدعا ہے اب دلِ بے مُدّعا ملے

دیتا ہے ترکِ عشقِ بُتاں کی صلاح تو

واعظ خُدا کرے، کہ نہ تجھ کو خُدا ملے

خاطر سے میری آپ اُٹھائیں نہ غیر کو

محفل میں جا ملے نہ ملے، دل میں جا ملے

دل خاک ہو کے بیٹھ نہ جائے تو کیا کرے

کوچے میں غیر کے جو ترا نقشِ پا ملے

حیراں کھڑا ہوا ہوں میں صحرائے عشق میں

یا وہ نصیب ہو، تو کوئی رہنما ملے

اُس گلبدن سے یوں ہُوئیں اختلاط ہے

گلشن میں جیسے پھُول سے بادِ صبا ملے

یہ گُلرخانِ دہر وہ گُل ہیں کہ نام کو

جن میں نہ خُوئے مہر، نہ بُوئے وفا ملے

ہے خرقہ و قبا پہ عبث نازِ امتیاز

یکساں ہیں جبکہ خاک میں شاہ و گدا ملے

عاشق کی موت وہ ہے کہ قرباں ہو جس پہ زیست

اور زیست وہ کہ موت کا جس میں مزا ملے

بیجا نہیں رکھوں جو میں محرومؔ اپنا نام

مجھ سے اگر نہ وہ بُتِ نا آشنا ملے

خزاں نے اُجاڑے چمن کیسے کیسے ہوئے خاک سرو سمن کیسے کیسے
ملے خاک میں دستِ جورِ خزاں سے گُل و لالہ و نسترن کیسے کیسے
دکھائے ہیں سودائے زُلفِ بُتاں نے ہمیں بھی خطا و ختن کیسے کیسے
ترے ہجر میں مل گئے ہم کو مونس غم و رنج و درد و محن کیسے کیسے
کبھی ہو کسی کے، کبھی ہو کسی کے بدلتے ہو صاحب چلن کیسے کیسے
مرے بُت سے بھی کوئی ملتا ہے دیکھوں ترے بُت ہیں اے برہمن کیسے کیسے

نہ محرم تو طبعِ موزوں پہ اترا
ہیں موجود اہلِ سخن کیسے کیسے

قطعہ

نہ کی قدر افسوس! اہلِ وطن نے گئے نامراد اہلِ فن کیسے کیسے
ہوائے زمانہ سے گُل ہو رہے ہیں چراغِ سرِ انجمن کیسے کیسے

پڑے قید میں سڑ رہے ہیں ستم ہے
مُحبّانِ قوم و وطن کیسے کیسے

فدا جان و دل و ایماں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
بُتِ گمراہ سے پیماں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

ملاتے آنکھ پروانے سے کیوں کر بزمِ اُلفت میں
طوافِ جلوۂ جاناں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

تصوّر حور کا اے شیخ! کیوں کر دل نشیں ہوتا
خیالِ عارضِ خوباں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

پشیماں ہیں وہ کر کے پُرسشِ حالِ دلِ شیدا
ہویدا حسرتِ پنہاں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

ہوا راہِ فنا میں جب نہ کوئی ہم سفر اپنا
اکیلے کُوچ کا ساماں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

ترے جویا تھے کم ہنگامۂ بازارِ عالم میں
تجھے جنسِ وفا! ارزاں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

کہاں تھا اختیار اپنا شمیمِ زلفِ جاناں پر
اگر صبر اے دلِ سوزاں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

بہائے اشکِ خوں ایسا ئے فصلِ گُل سے ہم نے بھی
اگر آرائشِ داماں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

یہ فطرت کا تقاضا تھا، کہ چاہا خوبرویوں کو
جو کرتے آئے ہیں انساں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

گئے محروم ہم عشقِ بتاں میں دین و دنیا سے
جو اس سودے میں یہ نقصاں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

۶۵

مٹے ہیں ذوقِ سخن پر یہ آرزو کرتے
کہ ہم بھی کاش! کبھی اُن سے گُفتگُو کرتے

زباں کو پھر نہ فغاں سنجِ آرزو کرتے
جو خاکِ پا کو تری سرمۂ گلو کرتے

قسم خدا کی زمانہ یقین کر لیتا
اگر خدائی کا دعویٰ یہ خُوبرو کرتے

تمھارے ہاتھ سے مرنا نصیب اگر ہوتا
"مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزُو کرتے"

دوائے دردِ اجل دہر میں اگر ملتی
علاجِ عارضۂ عشق چارہ جُو کرتے

دکھائی دیتے ہیں خوبوں کے عیب بھی اچھے
کہ چاکِ دامنِ گُل کو نہیں رفُو کرتے

علاجِ چاکِ جگر کی یہی تھی اک تدبیر!
کسی کے تارِ نظر سے اسے رفو کرتے

ریاضِ دہر میں دیتے ہیں جس کو داغِ دروں
برنگِ لالہ اُسی کو ہیں سُرخرُو کرتے

تری وفا کا یہ انجام تھا تو اے بیدرد
کبھی نہ دردِ محبّت کی آرزُو کرتے

قبائے عشق سے عاری ہیں حضرتِ محرومؔ
غزل میں نقلِ محبّت ہیں ہُو بہُو کرتے!

۶۶

یہ کس سے آج برہم ہو گئی ہے
کہ زلفِ یار پر خم ہو گئی ہے

ٹپکتے ہیں وقتِ صبح آنسو
یہ عادت مثلِ شبنم ہو گئی ہے

بظاہر گرم ہے بازارِ الفت
مگر جنسِ وفا کم ہو گئی ہے

نہ ہے تاثیرِ کوئے خاکِ جاناں
مرے زخموں پہ مرہم ہو گئی ہے

بس اے دستِ اجل کچھ رحم بھی کر
کہ دنیا بزمِ ماتم ہو گئی ہے

نہیں خوفِ شبِ ہجراں مجھے اب
مری غمخوار و ہمدم ہو گئی ہے

یہی حالت ہے اک مدّت سے محروم
طبیعت خوگرِ غم ہو گئی ہے

خدا سے وقتِ دُعا ہم سوال کر بیٹھے

وہ بُت بھی دل کو ذرا اب سنبھال کر بیٹھے

کیا ہے آنکھ کی گردش سے پیس کر سُرمہ

"وہ بے چلے ہی مجھے پائمال کر بیٹھے"

تمام عُمر پریشاں رکھا، دمِ آخر

بَلا سے میری پریشاں وہ بال کر بیٹھے

چلے ہیں طُور کو موسیٰ، مگر ہمیں مطلب؟

کہ ہم بتوں ہی میں یہ دیکھ بھال کر بیٹھے

رواں ہیں اشک کسی کے فراق میں یارب

کوئی نہ پرسشِ وجہِ ملال کر بیٹھے

بُرا ہو اُلفتِ خُوباں کا ہم نشیں! ہم تو

شباب ہی میں بُرا اپنا حال کر بیٹھے

نہ علم ہے، نہ زباں ہے تو کس لئے محروم

تم اپنے آپ کو شاعر خیال کر بیٹھے

متفرق اشعار

نہ ہرگز تشنگیِ شوق میرے دل سے نکلے گی
اگر نکلے گی آبِ خنجرِ قاتل سے نکلے گی
مرے آرام کی صورت، مرے ہی دل سے نکلے گی
میں جس لیلیٰ کا مجنوں ہوں اسی محمل سے نکلے گی
زمینِ شورِ اُلفت میں، نہ تخمِ آرزو بونا
کہ بہبودی نہ کچھ اس سعیِ لاحاصل سے نکلے گی
نکالے سے کسی کے کب گرہ دل کی نکلتی ہے
اگر محروم نکلی مرشدِ کامل سے نکلے گی

نے آرزوئے زیست نہ ذوقِ فنا مجھے
اتنا کوئی بتائے یہ کیا ہو گیا مجھے
وہ رنگِ شوق اب دلِ افسردہ میں کہاں
کیوں آپ پیستے ہیں برنگِ حنا مجھے

صحنِ چمن سے بادِ بہاری نکل گئی
صیّاد مار ڈال، نہ کر اب رہا مجھے
اس بے وفا کے گیسوئے مشکیں کی کیا خطا
محرومؔ اپنے دل نے پریشاں رکھا مجھے

فوّارہ ساں نہ جوشِ خودی میں اُچھل کے چل
نیچا ہے سر غرور کا غافل سنبھل کے چل
کر دے نہ سست رَو یہ تراہم سفر تجھے
اے تیغِ یار ساتھ نہ مل کر اجل کے چل
دو دن کا یہ اُبھار ہے، مہماں بہار ہے
اے گُل نہ اپنے جامے سے باہر نکل کے چل
محفل میں اُن کی غیر ہیں چلیئے کہ بیٹھیے
محرومؔ دیکھ شمع کو یعنی کہ جل کے چل

کس میں ہے رازِ بقا؟ گر اوجِ ہستی میں نہیں
چاند، سورج اور ستارے قعرِ پستی میں نہیں

ساغرِ خالی کو بھرتی ہے صراحی دم بدم
جھوٹ ہے کوئی کسی کا تنگدستی میں نہیں
وہ بھی دن تھے جبکہ ہم تھے دہر میں جنسِ گراں
قیمت اپنی آج کچھ بازارِ ہستی میں نہیں!

یادِ جمالِ دوست میں برقِ تپاں کی طرح
بے چین ہی رہا دلِ بے تاب ابر میں
عاری سدا کمال سے ہے اوجِ ظاہری
پانی کی بوند ہے، دُرِ نایاب ابر میں
کس کو اماں فنا سے، سفینہ ھلال کا
اوجِ فلک پہ ہو گیا غرقاب ابر میں
محروم جام و ساقی و شاہد سے کیا ہمیں
ہیں اشک و آہ شغل کے اسباب ابر میں

اے خوشا! جس نے پیا جام ترے ہاتھوں سے!
تری آنکھوں نے کیا جس کو خراب اچھا ہے

مدّعا عیش اگر ہو تو سمجھ اُس کو حرام

بیخودی گر ہو غرض بادۂ ناب اچھا ہے

کوئی ساعت تو مقرّر ہی نہیں جانے کی

ہر گھڑی جو ہے یہاں پا بر کاب اچھّا ہے

جس میں وا دیدۂ باطن ہو وہ غفلت اچھی ہے

دوست جس میں نظر آجائے وہ خواب اچھّا ہے

ہے صبح اور آج پریشاں ابھی سے ہیں

یعنی شبِ فراق کے ساماں ابھی سے ہیں

بل بے بہارِ عشق، کہ زخمِ جگر مرے

خجلت دہِ ہزار گُلستاں ابھی سے ہیں

روزِ جزا ہے دُور، پر اے کردگار، ہم!

شرمندۂ فزونیٔ عصیاں ابھی سے ہیں

محرومِ پختگی تو بہت دُور ہے، مگر

قائل ترے سخن کے سخنداں ابھی سے ہیں

کیا گزرتی ہے دلِ زار پہ غمخوار نہ پوچھ
کیسا ہوتا ہے غمِ ہجر کا آزار نہ پوچھ
مئے گلرنگ نہ دے، ساقیٔ بزمِ عشرت
اشکِ خوں دیکھ مرے، باعثِ انکار نہ پوچھ
گھیر لیتی ہیں شبِ ہجر بلائیں کیا کیا
کیا بتاؤں تجھے ظلمات کے اسرار نہ پوچھ

مزے کی چیز ہے ترکِ تمنّا اور ریاضت بھی
مگر کچھ کم نہیں واعظ، حسینوں کی محبت بھی
کوئی سوتا ہو جیسے ڈوبتی کشتی کے تختے پر
اگر کچھ ہے تو بس اتنی ہے اس دنیا کی راحت بھی
دوائے تلخ بچوں کو ہے دیتی مادرِ گیتی
نہیں بے مصلحت انساں کو دنیا کی مصیبت بھی

ہم گلشنِ دہر میں اے ہمدم، آزارکشِ بیداد رہے
سبزے کی طرح پامال ہوئے، نکہت کی طرح برباد رہے

جُوں شمع ہماری قسمت میں تھا گریۂ غم اور سوزِ نہاں

اے بزمِ جہاں کیا تیرا گِلہ، تو حشر تلک آباد رہے

اے چرخ یہ جھُوٹے دعوے ہیں ہم جیسے غم کے ماروں کے

تاثیر اگر ہو آہوں میں، قائم تیری بنیاد رہے

ہے جانتا بھی کہ ہوگا انجام نااُمیدی اِس آرزو کا

یہ دل کا دیوانہ پن تو دیکھو کہ پھر بھی سودا ہے جستجو کا

نہ کچھ صدائے شکست اس میں نہ اُس میں پرواز کی صدا ہے

نہیں ہے کچھ اعتبار اے باغباں، ترے گُل کے رنگ و بُو کا

پڑھا جو تعریفِ تابِ دنداں میں شعر میں نے کنارِ دریا

صدف سے نکلی صدا کہ ڈوبا، سفینہ گوہر کی آبرو کا

آپ کو مجھ سے کدورت نہیں، کیا فرمایا

صدقے اس صاف بیانی کے بجا فرمایا

گلشنِ کُوئے حسیناں سے جو تُو آتی ہے

مرے گُل نے بھی کچھ اے بادِ صبا فرمایا

کیسے بے مہر ہیں محرومؔ بتانِ عالم
اُن کو اللہ نے کیوں حُسن عطا فرمایا

تم بھی اے ماہ جبیں، آؤ یہاں آپ سے آپ
جیسے ہوتا ہے قمر جلوہ فشاں آپ سے آپ
رازِ اُلفت کو بہت ہم نے چھپایا، لیکن!
ہو گیا اشک کی صورت میں عیاں آپ سے آپ
ہم بھی محرومؔ کے اشعار ذرا دیکھیں تو
داد دیتے ہیں جسے اہلِ زباں آپ سے آپ

ہوں وہ غم نصیبِ ازل، جسے دلِ داغدار پسند ہے
نہ فضائے باغ سے اُنس ہے، نہ گلِ بہار پسند ہے
ہے ادب ترا مژہ صنم، نہیں رکھتا خار پہ میں قدم
کفِ پا کو ورنہ مرے قسم ہے کہ نوکِ خار پسند ہے
نہیں کم یہ داغِ جنوں، اگر تجھے لالہ زار کا شوق ہے
مری چشمِ دجلہ فشاں کو دیکھ جو آبشار پسند ہے

نظر فریب ہو گیا وہ حُسنِ جاں فزائے گُل!
کہ مثلِ عندلیب میں ہوا غزل سرائے گُل

ہوئے ہیں زینتِ چمن گُل انجمن در انجمن
ابھی تو جوشِ گُل نہیں ابھی ہے ابتدائے گُل

فلک ہے درپئے گزندِ مردمِ شگفتہ رُو
ریاضِ دہر میں ہمیشہ خار پر ہے پائے گُل

دلِ شیدا کی خطا کیا ہے جو دیوانہ ہے
آنکھ اُٹھتی ہے جدھر، دہر پریخانہ ہے

بے خبر آہ سے، فریاد سے بیگانہ ہے
جرأت آموزِ فنا عشق میں پروانہ ہے

پڑ گئی ایک نظر جس پہ اُڑے ہوش اُس کے
گردشِ چشمِ صنم گردشِ پیمانہ ہے

وہ جہاں میں ڈر ہے کونسا جو فلک نے مجھ کو دیا نہیں
نہیں شغلِ ماتمِ رفتگاں، کہ ملالِ خونِ وفا نہیں

جسے لوگ کہتے ہیں زندگی، وہ مرے لئے ہوئی جاں کنی
یہ مقامِ شکر ہے اے تِلک کہ ہمیشہ اِس کو بقا نہیں

وہ تو آئینِ وفا سے دُور ہیں
دل کے ہاتھوں ہم مگر مجبور ہیں
گو بظاہر ہیں اِسی دنیا میں ہم
درحقیقت اس سے کوسوں دُور ہیں

تجھے جن نگاہوں سے ہم دیکھتے ہیں
مری جان، اغیار کم دیکھتے ہیں
ترے زُلف و عارض کے محوِ تماشا
اندھیرا، اجالا، بہم دیکھتے ہیں

لوگ مر جاتے ہیں کیوں تیری گلی میں آکر
یہ وہ کوچہ ہے جہاں بچ کے قضا چلتی ہے
سوزِ فرقت ہے کہ کھنچوا تا ہے آہیں پیہم
آگ لگتی ہے تو محروم ہوا چلتی ہے

کھل سکے اُن پہ کِس طرح واقفِ سوز و ساز ہوں
چاہیئے اب کہ شمع ساں میں بھی زباں دراز ہوں

وہ کہہ گئے تھے کہ آئیں گے ہم چراغ جلے
نمودِ شام سے پہلے جگر کے داغ جلے

پڑھے ہے یہ دل کلمہ ہر آن اُس کا
وہ بُت بے وفا ہے تو ایمان اُس کا

قرارِ محرومِ منتظر کو کہاں شبِ انتظار آیا
نہ نیند آئی، نہ چین پایا، نہ موت آئی، نہ یار آیا

ہو گیا آخر تلف وہ کاروانِ آرزو
مُدّتوں جس نے اُڑائی دل کے ویرانے کی خاک

گنجِ معانی

محرومؔ کا پہلا مجموعۂ کلام

ہے داد کا مستحق کلامِ محرومؔ — لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے اُن کا سخن مفید و دانش آموز — اُن کی نظموں کی ہے بجا مُلک میں دھوم

اکبرؔ الہ آبادی

دوسرا ایڈیشن

قیمت سات روپے آٹھ آنے

رُباعیاتِ محرومؔ

مجھے یقین ہے کہ یہ رُباعیاں اُردو کے سنجیدہ ادب میں، جو بہت قلیل ہے ایک گراں بہا اضافہ کریں گی، اور اُن حضرات کو لطف اندوز ہونے اور فائدہ اُٹھانے کا بھر پُور موقع دیں گی، جو بجا طور پر اس کا یقین رکھتے ہیں کہ شاعری حیاتِ انسانی کو آرائش، آسودگی اور استواری کی دولت بخش سکتی ہے۔

جوشؔ ملیح آبادی

تیسرا ایڈیشن

زیرِ طبع

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار۔ دہلی

کاروانِ وطن

تیسرا مجموعۂ کلام

"...... میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں حضرتِ محروم کا کلام پڑھتا رہا ہوں۔ کئی بار بیاضیں بھی بنائیں اور اُن میں محروم صاحب کی نظمیں نقل کیں.... اب بھی کہیں اُن کی نظم دیکھ لیتا ہوں تو اُسی ذوق سے پڑھتا ہوں۔ اور اب آپ نے یہ مجموعے بھیج دیے ع من بہ بُوئے مست و ساقی پُر دہد پیمانہ را۔

میں کل پٹنہ سے یہاں رانچی آیا ہوں۔ یہ دونوں کتابیں میرے ساتھ ہیں۔ ان سے بہتر رفیق کہاں سے لاتا؟

(ڈاکٹر) ذاکر حسین خاں

قیمت سات روپے پچاس پیسے

بچوں کی دنیا
بچوں کی نظمیں
۴٫۰۰

نیرنگِ معانی
نیا مجموعۂ کلام
۵٫۰۰

بہارِ طفلی
بچوں کی نظمیں
۳٫۵۰

ملنے کا پتہ

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی

معیاری کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت	کتاب	مصنف	قیمت
گنجِ معانی (دوسرا ایڈیشن)	تلوک چند محروم	۷٫۵۰	افسانہ کہ حقیقت	ظفر واسطی	۲٫۲۵
رُباعیاتِ محروم ,,	تلوک چند محروم	۳٫۷۵	ہندوستاں ہمارا	بلونت سنگھ	۰٫۷۵
کاروانِ وطن	تلوک چند محروم	۷٫۵۰	آدمی	نسیم الہ آبادی	۱٫۷۵
نیرنگِ معانی	تلوک چند محروم	۴٫۰۰	حاشیئے	فراق گورکھپوری	۱٫۷۵
شُعلۂ نوا	تلوک چند محروم	۵٫۵۰	مشعل	فراق گورکھپوری	۲٫۷۵
بہارِ طفلی	تلوک چند محروم	۳٫۵۰	زنجیریں	تیغ الہ آبادی	۱٫۷۵
رُوپ	فراق گورکھپوری	۳٫۵۰	اقبال اور اس کا عہد	جگن ناتھ آزاد	۲٫۵۰
رمز و کنایات	فراق گورکھپوری	۳٫۵۰	تلوک چند محروم	جگن ناتھ آزاد	۴٫۰۰
بیکراں (تیسرا ایڈیشن)	جگن ناتھ آزاد	۴٫۵۰	جنوبی ہند میں دو ہفتے	جگن ناتھ آزاد	۱٫۰۰
ستاروں سے ذروں تک (دوسرا ایڈیشن)	جگن ناتھ آزاد	۲٫۷۵	عذرا یا ماہِ عرب	اویس احمد ادیب	۲٫۰۰
وطن میں اجنبی	جگن ناتھ آزاد	۳٫۵۰	تشریح و افعال الاعضاء		۲٫۰۰
نوائے پریشاں	جگن ناتھ آزاد	۳٫۰۰	پرتھال یا جورِ دکن	اویس احمد ادیب	۲٫۰۰
اُردو	جگن ناتھ آزاد	۰٫۵۰	عورت اور جدید معاشرہ	آغا حیدر مرزا	۲٫۲۵
انتخابِ کلام	جگن ناتھ آزاد	۱٫۷۵	دل سے قریب	انتظار حسین	۱٫۷۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی